آنکھ مچولی

اپریل سنہ ۱۹۹۰ء

اس شمارے کے ساتھ ایک حسین
عید کارڈ مفت حاصل کیجئے

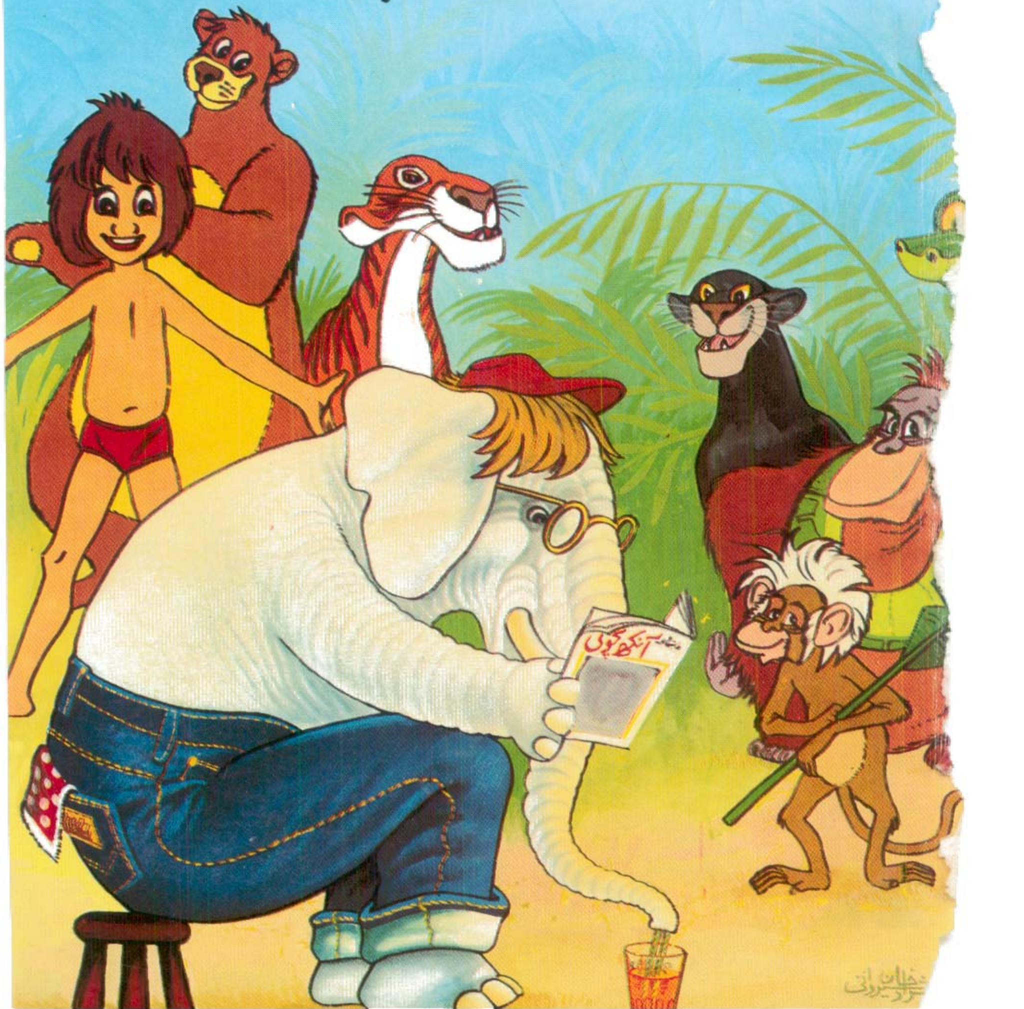

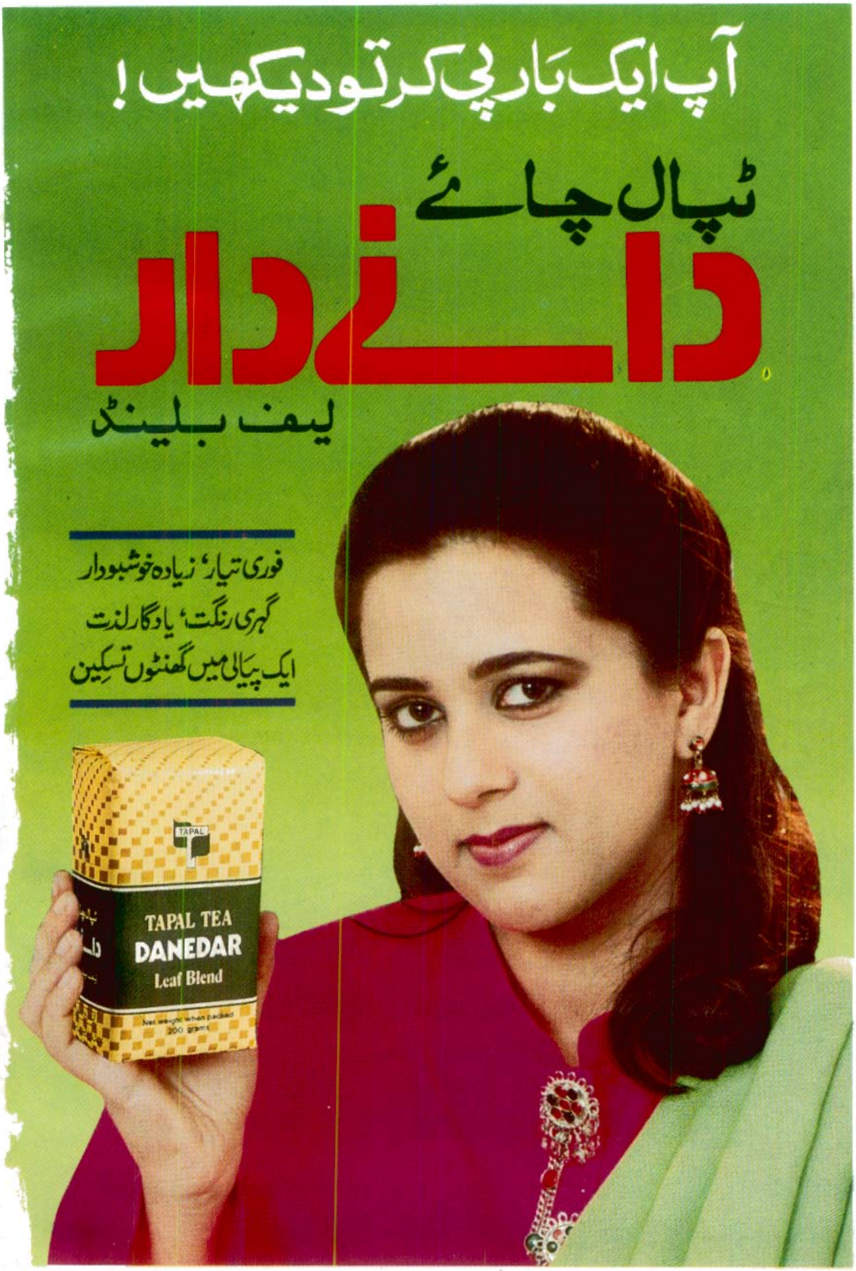

آپ ایک بار پی کر تو دیکھیں!
ٹپال چائے
دانے دار
لیف بلینڈ
فوری تیار، زیادہ خوشبودار
گہری رنگت، یادگار لذت
ایک پیالی میں گھنٹوں تسکین
TAPAL
TAPAL TEA
DANEDAR
Leaf Blend
Net weight when packed
200 grams

جب جی چاہے
کراچی کا مشہور
فروٹو فروٹ جوس پئیں
250ml
frooto
COACH
گرمی ہو یا برسات، دن ہو یا رات فروٹی فروٹ کا مزا ہر دم تازہ دعوت ہو یا پکنک ہر جگہ
ہر وقت فروٹو فروٹ جوس کے یہ پسندیدہ فلیور لذت و فرحت کے ضامن ہیں۔
مینگو، اورنج، مینگو اورنج مکس، لیمن بارلے اور انار۔
فروٹو ہر ایک کا پسندیدہ مشروب
KD کامران ڈسٹری بیوٹرز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
manhattan PAKISTAN

ہماری پہچان

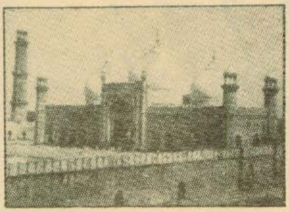

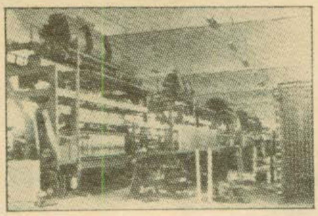

توحید
تاریخ
ترقی

توحیدِ اسلامی سے مشرّف ایک شاندار تاریخ
اور عظیم تہذیبی ورثے کی وارث ملّت پاکستان
کی ترقی کے لئے سرگرمی سے کوشاں ہے۔

نیشنل بینک آف پاکستان قومی ترقی قومی بینک

United PID-1-23/87

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی

مدیر اعلیٰ: ظفر محمود شیخ

مدیر مسئول: تجمل حسین چشتی

مشاورت: مشفق خواجہ، امجد اسلام امجد

مدیران اعزازی: طاہر مسعود، محمد سلیم مغل

مجلس ادارت: شاہ نواز فاروقی، ساجد سعید

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

جلد ۴ شمارہ ۱۰

اپریل ۱۹۹۰ء رمضان ۱۴۱۰ھ

فون ۲۹۹۱۷۸

- ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔
- ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا
- ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے شائع کیا۔

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: زاہد علی مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی
خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲۔ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

قیمت ۱۰ روپے، ۷ درہم، ۷ ریال
زر سالانہ کے لیے خصوصی بچت اسکیم کا صفحہ دیکھیے

خصوصی بچت اسکیم

آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے
کتنے سستے کتنے پیارے

۵۰ روپے کی
خصوصی رعایت اور
تحفہ مفت

آنکھ مچولی کے بارہ شماروں کی قیمت
مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ
۲۱۰ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبر شپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی
رعایت یعنی ۲۱۰ کے بجائے صرف ۱۵۰ روپے۔ اس طرح گویا
مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

زرِ سالانہ کی رقم دفتر کے پتے پر منی آرڈر کریں اور کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوادیں
آنکھ مچولی بیرونِ ملک منگوانے کے لئے زرِ سالانہ مُبلغ ۳۰۰/= روپے

سالانہ ممبر شپ آنکھ مچولی ۱۱۲۔ ڈی سائٹ کراچی

مرغِ تحریرنما

۹	وہ ہادی وہ رہبر (نعت)	محمد جاوید خالد
۱۰	تاریخ کے دریچے سے	
۱۱	اداریہ	
۱۲	ڈاکیہ ڈاک لایا	
۱۶	غزل پزل	اسامہ بن سلیم
۲۰	جب زباں خاموش ہو	سلمیٰ سلیم
۲۳	دو نسلوں کی منی باجی	طاہر مسعود
۲۹	دلدل (نیا سلسلے وار ناول)	حمید کاشمیری
۳۶	اس ہفتے میں ابو صاحب	شاہنواز فاروقی
۳۹	نہیں ہے چیز نکمی کوئی	رمیصا
۴۰	فرض	سلیم مغل
۴۵	باسکرول کا شکاری کتا	شاہنواز فاروقی
۵۵	کھٹ مٹھے - لطائف	
۵۹	ٹھگوں کو ٹھگ لیا	محمد تنویر شعیب
۶۲	فطرت کے کرشمے	شین فاروقی
۶۷	عید کارڈ	عمران مشتاق
۷۱	روزہ	ساجد سعید
۷۵	کبوتر اور شکرہ	مولوی محمد حسین
۷۷	معجزہ	سیّد خورشید عالم
۸۱	پانچ سو میل لمبی لائبریری	ارشد شاہین
۸۷	سائنس انکوائری	ایاز محمود
۹۱	ظلم کا انجام	امان اللہ نیر
۹۵	بُری بات	منیر احمد راشد
۱۰۰	گائے اور بکری (نظم)	علامہ اقبال
۱۰۳	انجانی مہم	امجد اسلام امجد
۱۱۲	تحریری مباحثہ	
۱۱۹	سراغ	اعجاز احمد ڈنگہ
۱۲۸	ننھی نگارشات	
۱۳۹	سالگرہ کے ساتھی	
۱۴۱	امی ابو کا صفحہ	ہما سلیم

آنکھ مچولی بک بینک کا قیام
کتابوں کی مفت فراہمی کا اہتمام

وطن عزیز کے لاکھوں طلبہ و طالبات کی فلاح کے لئے آنکھ مچولی کی جانب سے ایک نئے انوکھے اور مبارک سفر کا آغاز۔

اس سفر میں آپ کی شرکت منزل کے حصول کی ضمانت ہے۔ اس یادگار سفر میں شرکت کی نوعیت اور مراحل کچھ یوں ہوں گے۔

(۱) آپ خواہ کسی بھی کلاس میں ہوں اپنی وہ کتابیں سنبھال کر رکھئے جو، اب آپ کے یا آپ کے بھائی بہنوں کے کام نہیں آئیں گے۔

(۲) جن طلبہ و طالبات کے پاس ایسی کتابیں ہوں وہ اپنے نام، مکمل پتہ اور کتابوں کی مکمل تفصیل کے ساتھ آنکھ مچولی کو خط لکھیں۔

(۳) آنکھ مچولی آپکے خط کے ضروری مندرجات اور آپ کا نام پتہ نمایاں طور شائع کرے گا

(۴) آنکھ مچولی کے قارئین میں سے جن طلبہ و طالبات کو ان کتب کی ضرورت ہوگی وہ اسے ڈاک خرچ پر متعلقہ پتہ پر خط ارسال کر کے کتابیں حاصل کر لیں گے۔

(۵) یاد رکھئے کہ آپ کی فراہم کردہ کتب جتنی صاف ستھری اور سالم حالت میں ہوں گی وہ نہ صرف یہ کہ آپ کے ضرورت مند ساتھیوں کے لئے اتنی ہی مفید ہوں گی بلکہ اس سے آپ کے ساتھیوں پر آپ کے اعلیٰ ذوق اور سلیقہ مندی کا تاثر مرتب ہوگا۔

اس مہم میں شرکت کر کے آپ کو کیا مل جائے گا؟

- ○ اللہ کی خوشنودی ○ ملک و ملت کی تعمیر میں شرکت کا احساس
- ○ اپنے بہن بھائیوں کی مدد کی خوشی ○ اپنی خوامخواہ ضائع ہونے والی کتب کے بہترین مصرف سے حاصل ہونے والی مسرت

قافلہ علم کا جاتا ہے ذرا ساتھ چلیں
ہم کو دینی ہے جہالت کو ذرا مات چلیں

محمد جاوید خالد

نپولن ، ہلاکو و چنگیز و ہٹلر — زمانے میں گزرے ہیں فاتح تو اکثر
مگر آدمیت کے دشمن تھے سارے — انہوں نے ہزاروں ہی انسان مارے
یہ سب ظلم کی اک بڑی داستاں تھے — حقیقت میں ابلیس کے ترجماں تھے
وہ انسان کامل جو محبوبِؐ رب تھا — لقب جس کا شاہ عجم اور عرب تھا
برائی کی ہر شکل پہچانتا تھا — کھرا اور کھوٹا الگ جانتا تھا
اسی کے قبیلے اسی کے وطن کے — بچھاتے رہے لوگ راہوں میں کانٹے
کیا سب نے اس پر ستم ہر نرالا — جہانوں کے مالک کو گھر سے نکالا
وہ ہادی وہ راہبر وہ محسن ہمارا — کہ ظلمت کا ہر سلسلہ جس سے ہارا
وہ لوٹا تو اس شاں سے اپنے وطن کو — ہزاروں لٹاتے تھے اب جان و تن کو
عداوت کے عادی وہ ظالم ستم گر — زمانے نے ان سب کے دیکھے جُھکے سر
یوں انجام سے لوگ سب ڈر رہے تھے — کہ مرنے سے پہلے ہی وہ مر رہے تھے
پیمبرؐ نے لیکن عطا یوں اماں کی — نہ اندیشۂ زر نہ تکلیف جاں کی
یہ فرمایا تم سے نہیں کوئی پرسش — دعا دی ملے تم کو اللہ کی بخشش
کرم کی، محبت کی ایسی مثالیں — نہیں ہاتھ آتیں کوئی دور اٹھالیں
نبیؐ کا رہا کام و پیغام الفت — ہے اسلام کا دوسرا نام الفت
عزیزو جو خود کو مسلمان کہنا — نبیؐ ہی کی سیرت کو اپنائے رہنا
مسلماں کی ہے بس یہی تو نشانی — اخوت، محبت، کرم مہربانی

تاریخ کے دریچے سے

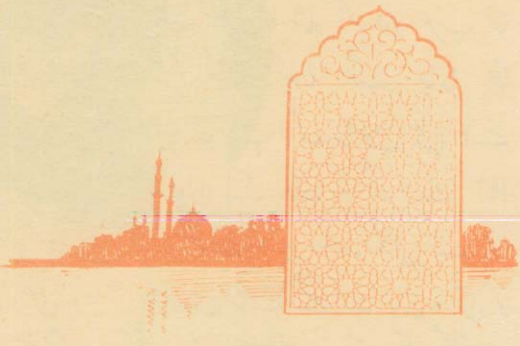

بو علی سینا کی مجلس میں کوئی صاحب بیٹھے ہوئے ادھر ادھر کی بیکار باتیں کر رہے تھے کہنے لگے "چند دن پہلے میرے ایک دوست سے تو تو میں میں ہو گئی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو خوب کھری کھری سنائیں، لیکن افسوس کہ کچھ ایسی باتیں مجھے یاد آ رہی ہیں جن کے نہ کہہ سکنے کا مجھے اب افسوس ہو رہا ہے" بو علی سینا نے ہنس کر کہا "لیکن مجھے آج تک اس بات پر افسوس نہیں ہوا کہ میں نے فلاں بات کیوں نہیں کی تھی بلکہ تمہارے برعکس اپنی کہی ہوئی بعض باتوں میں آج تک نادم ہوں"

اداریہ

ماہِ رواں کی پہلی بات

آپ اس شخص کو کیا کہیں گے جو آنکھیں بند کر کے دوسروں کی نقل کرتا ہو۔ یقیناً آپ اسے نقال قرار دیں گے۔ اور آپ اس قوم کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے جو اپنے برے بھلے کی پروا کیے بغیر دوسری قوم کے رسم و رواج کو اختیار کر لیتی ہو۔ ظاہر ہے ایسی قوم ذہنی غلام کہلائے گی۔ اس ذہنی غلامی کی صورت بعض اوقات بہت افسوسناک ہوتی ہے۔ مثلاً یہی دیکھئے کہ یہ مہینہ اپریل کا ہے۔ اسی مہینے کی یکم تاریخ کو مغربی ممالک ہی میں نہیں مسلم ملکوں میں بھی ''اپریل فول'' منایا جاتا ہے۔ اس روز دوست احباب ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے ہیں، انہیں بے وقوف بناتے ہیں اور اس پر جی بھر کے خوش ہوتے ہیں۔ عیسائی ملکوں کی یہ رسم انہی تک محدود رہتی تو قابل اعتراض بات نہ تھی لیکن آپ یہ دیکھئے کہ اس رسم کو ہم لوگوں نے بھی اختیار کر رکھا ہے۔ جبکہ ہم اس کے پس منظر سے واقف ہی نہیں ہیں اور نہ یہ جانتے ہیں کہ اپریل فول منایا کیوں جاتا ہے۔

مختصراً یوں سمجھئے کہ اسپین میں مسلمانوں کی حکومت کو آٹھ سو سال بعد جب زوال آگیا اور وہاں ایک عیسائی بادشاہ فرڈی نینڈ قابض ہو گیا تو اسپین کو مسلمانوں سے خالی کرنے کی سازش تیار کی گئی۔ اس سازش کے نتیجے میں اسپین کے مسلمانوں سے کہا گیا کہ انہیں یکم اپریل کو سمندری جہاز پر سوار کرا کے محفوظ مقامات پر پہنچایا جائے گا...... جب مسلمانوں کے گروہ جہاز پر سوار ہو گئے تو انہیں دور سمندر میں لے جا کر ڈبو دیا گیا...... اس کامیاب دھوکا دہی پر عیسائی آج بھی بغلیں بجاتے ہیں...... لیکن ان سے کیا شکایت اب تو خود ہمارے مسلمان بھائی بھی اس عمل میں شریک ہیں۔ ظاہر ہے وہ جانتے ہی نہیں کہ اس دن کی حقیقت کیا ہے۔ جب وہ جان جائیں گے تو اس دن ان کے کانوں میں اپنے ہی دینی بھائیوں کی چیخیں گونجیں گی جب انہیں فرڈی نینڈ کے گماشتے اٹھا اٹھا کر سمندر کی دیوانی لہروں میں پھینک رہے تھے۔ اپریل کا دن ہنسی مذاق کا نہیں اس بات پر غور کرنے کا دن ہے کہ ہم مسلمان آزاد ہو کر بھی غلام کیوں ہیں؟

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

ڈاکیا ڈاک لایا

ایم سلیم حمید جیل روڈ، کراچی: آنکھ مچولی کے مقابلے پر بہت سے رسالے ہیں۔ ان میں سے ایک آدھ تو تیس پینتیس سال سے نکل رہا ہے۔ لیکن جتنی محنت آنکھ مچولی پر کی جاتی ہے اور جتنا خوبصورت یہ رسالہ ہے اس کا جواب نہیں۔

○ ...... آپ کی تعریف اچھی تو لگی لیکن یہ خیال بھی آیا کہ آپ کی یہ تعریف ہمیں کاہل نہ بنا دے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ جتنی محنت ہم رسالہ نکالنے میں کرتے ہیں اتنی ہی محنت آپ اپنی پڑھائی میں کریں۔

نعیم اختر، ڈنگہ: انکل طاہر مسعود سے پوچھ کر بتائیں کہ "ضرب مومن" کا مقصد کیا تھا اس جنگی مشق کا کیا فائدہ ہوا؟ یہی رقم اگر جہلم کے غریب لوگوں کو دے دی جاتی تو کیا بُرا تھا؟

○ ...... شاید آپ نے "ضرب مومن" والا مضمون غور سے نہیں پڑھا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارا پیارا ملک پاکستان دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ پاکستان اپنے دشمن ملکوں سے اسی وقت مقابلہ کر سکتا ہے جب وہ فوجی لحاظ سے طاقتور ہو۔ "ضرب مومن" کے ذریعے پاکستان نے اپنے دشمنوں کو بتایا کہ وہ فوجی اعتبار سے ایک مضبوط ملک ہے۔ اور اسے کمزور سمجھنے والے منہ کی کھائیں گے۔

محمد سلمان، سنبل بورے والا: میرا خیال ہے کہ آپ کا رسالہ ہر قسم کی شکایت سے پاک ہوتا ہے لیکن فروری میں دو غلطیاں نظر سے گزریں۔ انجانی مہم پر محمد نوید مرزا کا مگر حسن ترتیب میں فہیم ساغر کا نام درج تھا۔ پتہ نہیں اصل مصنف کون ہے؟ اس طرح ذیشان بن صفدر کی کہانی کے کچھ حصے پڑھے نہ جاسکے۔

○ ...... انجانی مہم پر غلطی سے نوید مرزا کا نام چھپ گیا تھا۔ اصل مصنف فہیم ساغر ہی ہیں۔ اس کی معذرت رسالے میں چھپ گئی ہے۔ ذیشان بن صفدر کی کہانی میں طباعت کی خامی تھی۔ رسالے انسان نکالتے ہیں اور انسان غلطیوں کا پتلا ہے۔

محمد سراج شیخ، ٹنڈو آدم: تحفہ آزادی بہت چھوٹا تھا میری گزارش ہے کہ کہ آپ آئندہ آزادی کے موقع پر کوئی اچھا سا اور بڑا تحفہ ارسال کیا کریں۔

○ ...... بھئی تحفہ تو پھر تحفہ ہوتا ہے چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔ اور پھر ہمارا تحفہ تو اپنے پیارے ملک اور اس کے پرچم کے حوالے سے تھا۔ اس سے قیمتی تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

حماد شفیع، اسلام آباد: انکل! آنکھ مچولی دیر سے آنا شروع ہو گیا ہے اس وجہ سے ہمیں بار بار مارکیٹ جانا پڑتا ہے اس کا جواب ضرور دیجئے گا تاکہ مجھے تسلی ہو جائے۔

○ ...... آپ کی شکایت ٹھیک ہے۔ رسالہ دو ایک بار دیر سے بازار میں پہنچا۔ یہ شکایت انشاء اللہ آئندہ نہیں ہوگی۔

وسیم عباس شیخ، سیالکوٹ: ڈاکیہ ڈاک لایا کی لکھائی پہلے کی طرح باریک کرائیے تاکہ اس میں زیادہ سے زیادہ خطوط شامل ہو سکیں۔

○ ...... آنکھ مچولی، کی پہلے کتابت ہوتی تھی اب کمپیوٹر کے ذریعے اس کی کمپوزنگ ہوتی ہے۔ آپ کی تجویز پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اعجاز احمد، حیدر آباد: آپ نے جنوری اور فروری میں ایک بحث و مباحثہ منعقد کرنے کا اعلان کیا تھا لیکن مارچ کے شمارے میں اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا کیا آپ صرف اعلان کرتے ہیں یا اس پر عمل بھی کرتے ہیں؟

○ ...... آپ نے شکایت کرنے میں ذرا جلدی دکھائی اس شمارے میں بحث و مباحثہ شامل ہے ہم جو کہتے ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں آپ اتنی جلدی مایوس نہ ہوا کریں۔

عبدالباسط احمد، گلشن عثمان کراچی: بھئی آپ نے تو دل ہی خوش کر دیا معلومات عامہ کا غزل پزل بے حد پسند آیا داڑھیل کا اختتام اچھا تھا آپ نئی سلسلہ وار کہانی کب شروع کر رہے ہیں۔

○ ...... ہم آپ کا دل ہی تو خوش کرتے ہیں ساتھ میں کچھ غذا دماغ کو بھی فراہم کر دیتے ہیں مشہور ڈرامہ نگار حمید کاشمیری کی سلسلہ وار کہانی ملاحظہ کیجئے۔

حسنین، صادق آباد: آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ دس روپے لے لیتے ہیں اور تحفہ اتنا معمولی دیتے

ہیں کم از کم ایک پینسل ایک ربڑ یا شاپنر ہی دے دیا کریں۔
○...... دس روپے تو پرچے کی قیمت ہے تحفہ تو ہم آپ کو اپنی خوشی سے دیتے ہیں۔ تحفہ کیسا ہی ہو شکایت نہیں کرنی چاہئے بلکہ لے کر شکریہ ادا کرنا چاہئے اس سے تحفہ دینے والے کا دل بڑا ہوتا ہے۔

(؟) خیرپور۔ میرا مشورہ ہے کہ قہقہہ نمبر، اور خوفناک نمبر کے بعد آپ منشیات نمبر بھی نکالئے جس میں منشیات کے مہلک ہونے کے حوالے سے کہانی لکھی جائیں۔
○...... ہمارے ملک کے بچے بہت اچھے ہیں۔ اور خدا کا شکر ہے کہ ہمارے قارئین میں شاید ہی کوئی اس لعنت کا شکار ہو۔ منشیات پر کوئی مضمون تو چھاپا جاسکتا ہے پورا رسالہ نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔

نفیس احمد خان، کوٹری سندھ۔ انکل میرے پاس اب تک اسی کہانیاں اور نظمیں موجود ہیں ان میں سے تیس مختلف رسالوں کو بھیج چکا ہوں اب میرے پاس پچاس تحریریں موجود ہیں میری اب تک کوئی تحریر کسی رسالے میں شائع نہیں ہوئی مجھ میں ایک کامیاب مصنف بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں بس آپ کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔
○...... ہمیں یہ سن کر واقعی مسرت ہوئی کہ آپ نے اب تک اتنی ڈھیر ساری چیزیں لکھ ڈالی ہیں اگر آپ کی کوئی تحریر شائع نہیں ہوتی تو اس میں ضرور کوئی کمی ہوگی مطالعہ جاری رکھئے آپ کی تحریر کبھی نہ کبھی ضرور چھپے گی۔

عمر منیر، اٹک۔ آنکھ مچولی میں اب صفحات خراب آنے شروع ہوگئے ہیں کیوں کہ دوسرے صفحے سے پہلے صفحے کی چھپائی صاف نظر آتی ہے اس کے علاوہ جہاں کوپن ہے وہاں اس کے ارد گرد سوراخ کر دیں تاکہ کوپن پھاڑنے میں آسانی ہو۔
○...... آپ کا خط پڑھ کر ہم نے رسالے کو غور سے دیکھا ایسی تو کوئی بات نظر نہیں آئی۔ ہاں دوسرا مشورہ واقعی قابل غور ہے۔

شاہد اقبال، گوجرانوالہ۔ ڈاک کے کالم کے سلسلے میں ہر قاری کو ایک بار اس کا کوئی نمبر الاٹ کر دیا جائے اور بعد میں اس قاری کا خط ملنے پر وہ نمبر پرچے میں شائع کر دیا جائے اس طرح تھوڑی سی جگہ پر بہت سے قارئین کے خط کی رسید مل جایا کرے گی۔ کیوں کیسا ہے؟
○...... بہت عمدہ زرا سوچئے شاہد اقبال کے بجائے اگر آپ کا نمبر پچپن ہو تو جواب کچھ اس طرح ہوگا مسٹر پچپن آپ کا خط ملا پڑھ کر خوشی ہوئی کیوں کیسا ہنسی نہیں آئی؟

ایک عجیب و غریب خط بلاتبصرہ

ہاں تو بھئی! تمہارا تازہ شمارہ اس وقت میرے ہاتھ میں ہے ٹائٹل اچھا ہے ویسے تم اپنا سرورق قدرتی مناظر سے سجایا کرو تو بڑا مزہ آئے گا۔ معلوم ہوا کہ تمہارے رسالے میں کچھ نئے قارئین کا اضافہ ہوا ہے۔ اچھی بات ہے۔ خدا کرے کہ ان کی شمولیت تمہارے لئے بہتر ثابت ہو۔ ہاں! مجھے تم سے ایک شکایت ہے بلکہ دوسرے لفظوں میں تنقید کر رہا ہوں۔ برا تو نہیں مناؤ گے۔ (ویسے میرے خیال میں تم خاصے عالی ظرف ہو) وہ بات یہ ہے کہ افغانستان اور کشمیر کے بارے میں کوئی تحریر صفحوں پر نظر نہیں آئی۔ کیا ان کا تم پر کوئی حق نہیں؟ ضرور بتانا۔ ایک تجویز بھی ہے ذرا غور سے سننا۔ اس دفعہ آپ نے اپنے قارئین کے لئے آرٹ گیلری کا آغاز کیا ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ اس کے بجائے تم خطاطی کے مقابلے کراؤ۔ مصور تو بہت ہیں مگر یہ چیز (یعنی خطاطی) عام رسالوں میں نہیں پائی جاتی۔ اس طرح تم منفرد بھی ہو جاؤ گے۔ اور بچوں میں بھی اس چیز کا شوق پروان چڑھے گا۔ تمہیں یہ تجویز کیسی لگی۔ کچھ تحریریں بھی ارسال کر رہا ہوں۔ کیسا سلوک کرتے ہو یہ تم پر منحصر ہے۔ اس کے علاوہ رسالہ بیمار بیمار سا ہے اس کو خوراک کی ضرورت ہے میں نے ڈاکٹر سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ اس کے صفحات پہلے جتنے تھے یعنی (۱۶۰) اتنے ہی کر دیں تو تندرست ہو جائے گا۔

کافی سر کھالیا۔ ویسے یہ میرا حق تھا بحیثیت قاری میں اپنے حق کو خوب جانتا ہوں۔

والسلام

طارق محمود انجم

عثمان آباد رحیم یار خان

رقیہ آرزو، کوئٹہ: آپ کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ ہماری سرزمین پر بولی جانے والی سب زبانیں بہت میٹھی بہت سندر خوبصورت اور پیاری ہیں آپ نے مقابلہ تحریر کرا کے ہزاروں دلوں کو جیت لیا واقعی اس کی اشد ضرورت تھی۔

○ ...... شکریہ! شکریہ!! شکریہ!!! شکریہ!!! شکریہ؟

رفیہ شبیر احمد، ساہیوال: مجھے کہانی لکھنے کا بہت شوق ہے میں ہر قسم کی کہانی لکھ سکتی ہوں اب آپ یہ بتائیے آپ کو مزاحیہ یا سنجیدہ ...... کون سی کہانی بھیجوں؟

○ ...... دیکھئے ہم ذرا سنجیدہ لوگ ہیں اس لئے مزاحیہ کہانیاں پہلے بھیجئے۔

غزل پزل

اسامہ بن سلیم

ماہانہ مقابلۂ معلومات

مقابلے کا کوپن اس ماہ شائع نہیں کیا جارہا شرکت کیلئے سادہ کاغذ استعمال کریں

غزل پزل میں آپ کی دلچسپی کا اندازہ آپ کے لاتعداد خطوط سے ہو گیا۔ پسندیدگی پر شکریہ قبول کیجئے اور تیار ہو جایئے مقابلہ نمبر ۲ کے لئے۔ دیکھیں، اس بار آپ کی ذہانت ہمارے چیلنج کا کیا جواب دیتی ہے...... طریقہ کار تو آپ جانتے ہی ہیں۔ آپ ۱۰ خانوں میں بنی ہوئی تصاویر کو شناخت کریں گے اور غزل کا ہر شعر جواب تک پہنچنے میں آپ کا مددگار ہو گا۔

تمام عالم نظر میں رکھو تمام دشت و نگر میں دیکھو
کسی کو ڈھونڈو شکست میں تم کسی کو فتح و ظفر میں دیکھو

میں اک ستمگر کی ہوں نشانی ، بڑی عجب ہے میری کہانی
جو ہوسکے تو غضب میں ڈھونڈو جو پاسکو تو قہر میں دیکھو

سنو سنو میری بانسری کو ، نظر کرو میری بے حسی پہ
شہر سے اٹھتے دھویں میں دیکھو ، سلگتے جلتے شہر میں دیکھو

کشاں کشاں آؤ میری جانب، سنو کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں
فلک کی جانب نگاہ کرکے مجھے ستاروں کے گھر میں دیکھو

میں ایک آتش فشاں ہوں ایسا کہ سو رہا ہوں، نہ جانے کب سے
نکل کے اپنے وطن سے باہر کسی جزیرہ نگر میں دیکھو

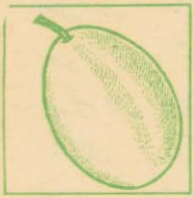

کٹھن بہت ہے جواب پانا ، مگر نہ ہمت کو ہار جانا
اسے ہے کھانا تو دیش جاکر وہاں کے پھل اور ثمر میں دیکھو

نظر نہ آؤں مگر سناؤں تمہیں میں قصّے غضب غضب کے
مجھی سے ہیں ٹی وی ریڈیو سب، مجھے فضاء کے سفر میں دیکھو

ہمیں جو دیکھو تو مسکراؤ ، نظر نہ ٹی وی سے تم ہٹاؤ
ہیں، شوخ کیسے شریر کتنے ، ہمیں ہمارے ہنر میں دیکھو

مجھے بچاؤ میں کھو رہا ہوں ، زمین چیں پر میں رو رہا ہوں
ہے تم پہ لازم کرو حفاظت ، ہے نسل میری خطر میں دیکھو

اگر چہ صدیاں گزر چکی ہیں مگر میں اب بھی عظیم تر ہوں
گذرتے لمحوں کا نقش ہوں میں مجھے تم اپنے عصر میں دیکھو

مقابلہ نمبر ا ماہ مارچ کے درست جوابات (۱) ہٹلر (۲) قائد اعظم
(۳) مرسیڈیز کار (۴) پیسا کا ٹاور (۵) عقاب شاہین (۶) کشمیر
(۷) آگے بچوں کی گزر گاہ ہے (۸) اقوام متحدہ (۹) امن کا نشان
(فاختہ اور زیتون کی شاخ) (۱۰) ایٹم

انعامات حاصل کرنے والے تین خوش نصیب (۱) تانیہ حیدر محمود آباد کراچی۔ (۲) ثوبان علی غازی ماڈل کالونی کراچی۔ (۳) عرفان عزیز حبیب آباد کوہاٹ

درست جوابات ارسال کرنے والے ساتھی۔

آصف مونگ ایف بی ایریا کراچی۔
سعدیہ خورشید نشتر روڈ کراچی۔
سید قیصر عباس ناظم آباد کراچی۔
اسماء عثمان کریم آباد کراچی۔
تہمینہ عابد نارتھ ناظم آباد کراچی۔
شہلا گرامی ایف۔ بی۔ ایریا۔ کراچی۔
عدیل عالم خان منگھو پیر کراچی۔
سید علی سلمان ناظم آباد کراچی۔
شفق یعقوب ماڈل کالونی کراچی۔
انیلا مبین نواب شاہ سندھ۔
محمود ریحان سرفراز بہاولپور۔
ارم شفیق نیول کالونی کراچی۔
شمشاد روشن علی گارڈن کراچی۔
محمد صدیق لاکھانی بھیم پورہ کراچی۔
سلمہ انصاری ناظم آباد کراچی۔
کاشف شہزاد کراچی۔
محمد سلمان خان سنبل ضلع وہاڑی۔
جاوید بشیر نواب شاہ سندھ۔
آصف وقار آصف واہ کینٹ۔
صدف رحمان ساہیوال۔
محمد فیصل محسن ماڈل کالونی کراچی۔
دیبا سلطانہ کوآپریٹیو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی
عبد الماجد مغل کورنگی۔

فوزیہ مجیب ناظم آباد کراچی۔
طیب جمیل قریشی سیالکوٹ۔
زاہد نسیم بابر ملیر ہالٹ کراچی۔
علی عدنان جان فیصل آباد
وحید عامر بوریوالہ وہاڑی۔
عمر فواد سعود آباد ملیر کراچی
سلمان علی خان فیڈرل بی ایریا کراچی
عندلیب اقبال اقبال ٹاؤن لاہور۔
نوید ارشد ملتان
جمیل الدین احمد بہادر آباد کراچی۔
مدیحہ شمیم گلشن اقبال کراچی۔
عدیل احمد کراچی۔
سید جنید اقبال ...... عزیز آباد، کراچی
سیدہ شفق غزالہ ...... ایف بی ایریا، کراچی
نعمان ناصر ...... یونیورسٹی روڑ، کراچی
سید محمد علی ...... فیصل آباد
مسرت حفیظہ ...... ایف بی ایریا، کراچی
شارق شمیم ...... تاج کالونی، کراچی
عابد حسین انجم ...... نواب آباد، واہ کینٹ
وسیم احمد ...... رحمانپورہ، لاہور
محمد عبداللہ ...... دستگیر کالونی، کراچی
سمنان الرحمٰن آخوند ...... کراچی

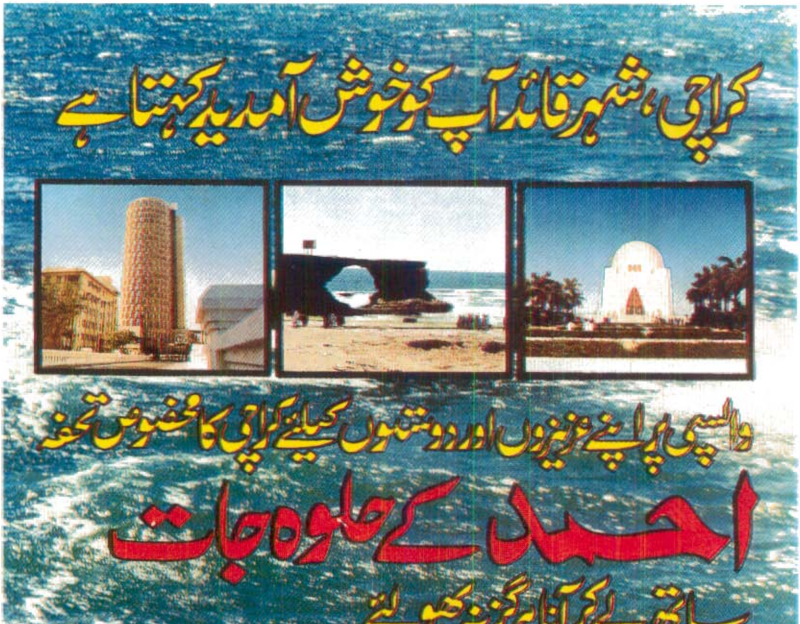
کراچی، شہر قائد آپ کو خوش آمدید کہتا ہے
واپسی پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے کراچی کا مخصوص تحفہ
احمد کے حلوہ جات
ساتھ لے کر آنا ہرگز نہ بھولیے
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
سوہن ڈیلائیٹ
Freshwel
MANGONICA
MASS

جب زباں خاموش ہو تو بولنے لگتے ہیں ہاتھ

کتا بھی جانتا ہے رُکنے کا یہ اشارہ !

شہادت کی انگلی انگوٹھے سے مل کر
یہ کہتی ہے ہم سے کہ سب ٹھیک ہے جی

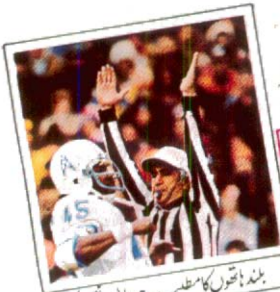

بلند ہاتھوں کا مطلب ہے بال نیچے رکھو

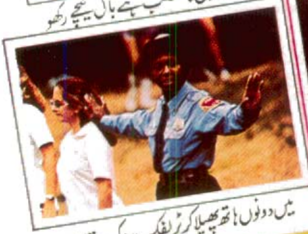

میں دونوں ہاتھ پھیلا کر ٹریفک روک دیتا ہوں

جیت کا اظہار
کرنے کے لئے

آپ کو سننا پڑیگی
میری بات

ٹھیک بولو ورنہ
پیارے چپ رہو

اُف خدا یہ کتنی
اچھی چیز ہے

خوشی کو اس طرح
کرتے ہیں ظاہر

نہ جانے یہ کسے
دھمکا رہے ہیں

لیا جاتا ہے یوں
بچے کو گودی

خدا کا شکر ہے
انسان ہیں ہم

انگلی پہ چڑھی انگلی کیا ہم کو بتاتی ہے ؟

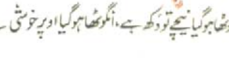

انگوٹھا ہو گیا نیچے تو دکھ ہے، انگوٹھا ہو گیا اوپر خوشی ہے

یہ گہرا راز اب ہم کھولتے ہیں
ہمارے ہاتھ کیا کیا بولتے ہیں؟

سلمیٰ سلیم

انسانی زندگی میں اشاروں کی بڑی اہمیت ہے۔ بعض صورتوں میں اگر ہم مخصوص اشارے نہ کر سکیں تو کنارے (یعنی ہمارے مقاصد) بہت دور ہو جاتے ہیں۔ ہم سب لوگوں کو اپنی روزانہ کی زندگی میں صبح سے شام تک متعدد مرتبہ اشاروں سے سابقہ پڑتا ہے۔ دور سے گزرتے ہوئے دوست کو ہاتھ ہلا کر اطلاع دی جاتی ہے کہ ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ روتے ہوئے چھوٹے بھائی کو گھور کر بتایا جاتا کہ خاموش ہو جاؤ۔ ورنہ ...... وغیرہ وغیرہ۔ یوں تو اشاروں کے سلسلہ میں جسم کے تمام اعضاء ہی استعمال ہوتے ہیں مگر اس سلسلہ میں ہاتھوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

زبان کے بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ انسان نے جب زبان ایجاد نہیں کی تھی تو وہ اپنے جسم کے اعضاء کے اشاروں کے ذریعہ ہی ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کیا کرتا تھا۔ تاہم آج جب کہ دنیا بھر میں بے شمار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اشاروں کے ساتھ بات چیت کی اپنی اہمیت برقرار ہے۔ یہ زبان خاص طور پر گونگے اور بہرے افراد کے لئے زندگی کی علامت ہے۔

اشاروں کی زبان جو بیشتر صورتوں میں ہاتھوں کے ذریعہ بولی جاتی ہے مختلف خیالات اور الفاظ کے نعم البدل کے طور پر کام آتی ہے۔ اس زبان کے بنیادی اشاروں کی تعداد ڈیڑھ ہزار ہے اور ان ڈیڑھ ہزار اشاروں کے ذریعہ کسی بھی خیال یا لفظ کی ادائیگی ممکن ہے۔

تاہم وہ الفاظ جن کے لئے کوئی اشارہ مخصوص نہیں ہے ان کی ادائیگی کے لئے انگلیوں کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اس صورت میں لفظ کو توڑ کر حروف میں تقسیم کر لیا جاتا ہے۔ اور پھر اس لفظ کے ہر حرف کو علیحدہ علیحدہ اشاروں کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر آپ کہیں کہ ''وہ صبا ہے'' فرض کریں اس جملے میں موجود لفظ ''وہ'' اور ''ہے'' کے لئے تو اشارے موجود ہیں مگر ''صبا'' کے لئے نہیں چنانچہ ایسے میں یہ کیا جائے گا کہ ''ص'' ''ب'' اور ''الف'' کو علیحدہ علیحدہ اشاروں کے ذریعہ ادا کر کے اپنا جملہ مکمل کیا جائے گا۔ یہ زبان بظاہر بڑی مشکل ہے مگر صرف ان لوگوں کے لئے جو محنت سے جی چراتے ہیں۔ اگر آپ کا دل چاہے کہ آپ بھی معصوم معصوم سے گونگے بہرے، بچوں کی باتیں سمجھیں اور ان کے ساتھ بات چیت کریں تو آپ بھی یہ زبان سیکھ سکتے

ہیں۔ ہمارا دل چاہتا ہے کہ چیخ چیخ کر باتیں کرنے والے بچے اور بد زبانی کرنے والے بچے تو یہ زبان ضرور ہی سیکھ لیں۔ اس سے ہزاروں گھر اور ہزاروں ذہن پر سکون ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس زبان کے دو بڑے فائدے ہیں۔ایک تو یہ کہ اس کے بولنے سے شور نہیں ہوتا اور دوسرے یہ کہ اس کے ذریعہ بد زبانی کرنا ذرا مشکل کام ہے۔ تو پھر کون کون سیکھ رہا ہے یہ زبان؟؟ بھئی ہم تو پہلے ہی کم بولتے ہیں۔

کیا آپ کو ہاکی سے دلچسپی ہے؟

اپنے قومی کھیل سے محبت کا ثبوت یوں دیجئے

ہاکی کھیلئے بھی　　ہاکی جانئیے بھی

ہاکی کے دلچسپ قوانین، حیرت انگیز قائدے اور بیش بہا معلومات پر مبنی

ہاکی گائیڈ۔ پڑھیئے

اخگر انوار کی لاجواب تالیف

ہاکی گائیڈ حاصل کرنے کے لئے
۱۰/- روپے کے ڈاک ٹکٹ بھجوائیے

گرین گائیڈ اکیڈمی۔

۱۱۲۔ ڈی سائیٹ۔ کراچی ۱۶

طاہر مسعود

دو نسلوں کی مُنّی باجی

ریڈیو پروگرام "بچّوں کی دنیا" کی مقبول کردار

وقت گزرتے کب دیر لگتی ہے - کل ہی کی جیسے بات ہے۔ ہم بچے تھے اور اتوار کی صبح دس بجے ریڈیو کے سامنے جمع ہو کر اُس آواز کو سننے کے منتظر رہتے تھے جسے سارا ملک "مُنّی باجی" کے نام سے پہچانتا تھا۔ مُنّی باجی ننھے منّے بچّوں کے ساتھ اپنا مقبول پروگرام پیش کیا کرتی تھیں۔ "ہاں تو بچّو! اب باری ہے نظموں کی .... ہاں بھئی تو آج سب سے پہلے نظم کون سنائے گا۔ اچھا آپ سنائیں گے۔ شاباش آگے آئیے۔

"اپنا نام تو بتایئے۔"

"گڈّو"

"بھئی ماشاالله بہت پیارا نام ہے۔ آپ کیا سنائیں گے گڈو میاں"

"نظم سناؤں گا" گڈو میاں کی شرمیلی آواز۔

"چلئے جلدی سے سنا دیجئے۔ شاباش!"

"کوّے ہیں سب دیکھے بھالے
چونچ بھی کالی پر بھی کالے"

"ہاں آگے تو سنائیے"

"بس اتنی ہی یاد ہے"

"بہت خُوب! بہت اچھّے" (بچوں کی تالیاں)

اس زمانے میں ظفر بھیا بھی پروگرام میں آیا کرتے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ ظفر بھیا اتنے بڑے ہو گئے کہ انہیں بھّیا کہلاتے ہوئے بُرا لگنے لگا۔ لیکن مُنّی باجی پھر مُنّی باجی رہیں۔ سدا بہار، ہمیشہ کی طرح ہنستی کھلکھلاتی ہوئی۔ بچوں سے پیاری پیاری باتیں کرتی ہوئی۔ ہمیں مُنّی باجی کو دیکھنے اور ان سے ملنے کا بچپن سے ہی شوق تھا۔ پھر ایک دن کراچی ریڈیو اسٹیشن پر کسی نے آواز دی "مُنّی باجی!"

ہم نے مڑ کر ادھر ادھر دیکھا تو مُنّی باجی دروازے پر کھڑی تھیں۔

وہ واقعی مُنّی باجی تھیں۔

سننے میں بھی مُنّی باجی دیکھنے میں بھی مُنّی باجی۔

مُنّی باجی کو ریڈیو سے پروگرام کرتے ہوئے اب آدھی صدی بیتنے والی ہے۔ اتنے لمبے عرصے میں دو نسلیں جوان ہو گئیں ریڈیو کے اسٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے وہ ساٹھ سال کی عمر پر ریٹائر ہو گئیں لیکن بچوں کا ساتھ اب بھی نہیں چھوٹا۔ ہر جمعہ کی صبح وہ ریڈیو اسٹوڈیو میں پچاس ساٹھ بچوں کے درمیان گھری بیٹھی ہوتی ہیں۔ کبھی نظمیں سنائی جارہی ہیں، کبھی گیت اور نغمے گائے جارہے ہیں، کھٹی میٹھی باتیں بھی ہو رہی ہیں، تقریری مقابلے بھی ہو رہے ہیں، انعام بھی بٹ رہے ہیں۔ پتہ نہیں بچے اس پروگرام کو زیادہ پسند کرتے ہیں یا مُنّی باجی کو۔ کراچی کے ہنگاموں کے بعد کتنا سخت کرفیو تھا! سڑکیں گلیاں سبھی سنسان پڑی تھیں۔ لیکن جمعہ کی صبح سارے بچے اسٹوڈیو میں موجود تھے۔ تب ہم نے سوچا کہ مُنّی باجی سے ملنا چاہئے۔ آنکھ مچولی کے لئے ان سے خوب ڈھیر ساری باتیں کرنی چاہئیں۔

یہ منگل کی ایک دھوپ سے بھری دوپہر کا ذکر ہے۔ ریڈیو کے مقبول پروگرام "بچوں کی دنیا" کے پروڈیوسر پرویز اختر کے ہمراہ ہم مُنّی باجی کے گھر پہنچے۔ ریڈیو اسٹیشن کے پیچھے کی ایک گلی کے تقریباً نکڑ پر ان کا مکان تھا۔ وہ روزے سے تھیں اور تھوڑی دیر بعد اپنے کسی عزیز کے ہاں جانے والی تھیں۔ انہوں نے بڑی شفقت سے ہم لوگوں کو اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

"مُنّی باجی! آپ کا پروگرام سنتے ہوئے ہمیں تو زمانے گزر گئے۔ آپ خود کتنے عرصے سے یہ پروگرام کر رہی ہیں؟"

مُنّی باجی 'بچوں کی دُنیا' میں ننھے مُنّے بچوں کے درمیان

"یہ تو ہمیں خود بھی ٹھیک سے یاد نہیں۔" مُنّی باجی بولیں "دہلی میں جب ریڈیو اسٹیشن کسی کوٹھی میں تھا اس وقت سے میں بچّوں کا پروگرام کر رہی ہوں۔ اس میں، مَیں مُنّی بہن کہلاتی تھی۔ شاید یہ ۴۶-۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ ہم لوگ شملے میں رہا کرتے تھے اور آپ جانتے ہیں کہ شملے میں سردی کا زمانہ کتنا سخت ہوتا ہے۔ سردیوں میں ہم دہلی آجایا کرتے تھے۔ یہیں سے میں نے اس پروگرام میں حصہ لینا شروع کیا۔"

"ریڈیو تو ان دنوں بالکل نئی اور انوکھی چیز ہوتا ہوگا۔"

"ہاں اور کیا۔" مُنّی باجی نے اقرار میں گردن ہلائی "مجھے یاد ہے جب پہلی بار ہمارے گھر میں ریڈیو آیا تو اسے کسی دلہن کی طرح اتارا گیا تھا۔ ہم لوگ بڑے تجسّس اور شوق سے ریڈیو کے سامنے بیٹھا کرتے تھے۔ گاؤں کی عورتیں آتی تھیں تو جھانک جھانک کر ریڈیو سیٹ کے پیچھے دیکھتی تھیں کہ شاید اس کے پیچھے چھوٹے چھوٹے آدمی چھپے بیٹھے ہیں اور بول رہے ہیں۔ ریڈیو کے پروگرام سن کر ہمارا جی چاہتا تھا کہ اس کے پروگرام میں حصہ لیں۔ میرے دادا محمد حسین خادم کے ایک دوست تھے، بہزاد لکھنوی۔ مشہور شاعر تھے۔ انہیں جب میرے شوق کا علم ہوا تو وہ مجھے ریڈیو لے گئے۔ پہلے پروگرام میں تو میں نے الحمد شریف سنا دی کیونکہ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ پھر جب اردو پڑھنی آگئی تو ڈراموں میں حصہ لینا شروع کیا۔ اسی کے بعد بچّوں کے پروگرام میں کمپیئرنگ کرنی شروع کر دی۔"

"ایک پروگرام کا کتنا معاوضہ ملتا تھا؟"

"پانچ روپے۔ اور یہ بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کہاں خرچ کریں۔ شروع میں تو ہم سمجھتے تھے کہ پیسے کھیتوں میں پھلتے ہیں۔ اس لئے جب عیدی ملتی تھی تو اسے کھیت میں دبا آتے تھے کہ تھوڑے دنوں میں پیسوں کا درخت اُگ آئے گا جس میں سے خوب سارے روپے پیسے نکلیں گے۔ "

"تو پھر کیا روپوں کا درخت کبھی اُگا!"

"لاحول ولاقوۃ ...... وہ بچپن کی بیوقوفانہ سوچ تھی۔ کہیں روپوں کے بھی درخت ہوتے ہیں۔" مُنّی باجی نے سادگی سے کہا۔ "

"بچپن میں آپ نے شرارتیں بھی خوب کی ہوں گی؟"

"کوئی خاص نہیں۔ بس آلوچے کے درخت پر بیٹھ کر آلوچے کھایا کرتے تھے۔ پھر اچانک ہمارے ابّا کا انتقال ہو گیا، پاکستان بنا تو ساری جائیداد ہاتھ سے نکل گئی۔ دادا کو جوان بیٹے کی موت کا اتنا صدمہ ہوا کہ وہ کسی قابل ہی نہیں رہے۔ میری عمر بارہ برس تھی۔ میں اپنے پانچوں بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ اسی لئے ساری ذمہ داریاں مجھ پر آپڑیں۔ بچپن کا عرصہ تو بہت تھوڑی دیر کے لئے رہا۔ زندگی میں کچھ بننے کے لئے آدمی کو بہت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ "

"پھر پاکستان آکر آپ نے ریڈیو پر پروگرام کرنے شروع کئے؟"

"پاکستان بننے کا اعلان ہوا تو فسادات شروع ہو گئے۔ مجھے وہ منظر اب تک نہیں بھولتا۔ میں ابّا کے ایک دوست مولوی عبدالرّب کے پاس مولانا مودودیؒ کی کتابیں اور چیک لیکر جا رہی تھی۔ کتابیں تو انہیں دینی تھیں اور بینک سے رقم نکلوانی تھی۔ گھر سے ذرا آگے گئی تو عجیب ہی منظر دیکھا۔ سکھ ننگی تلواریں لئے مسلمانوں کو مار رہے تھے، ان کی تلواروں سے خون ٹپک رہا تھا۔ قریب ہی ریڈیو اسٹیشن تھا۔ میں بھاگ کر وہاں پہنچ گئی اور وہیں رات کے دو بج گئے۔ بھوکے پیاسے۔ پھر فوج کی گاڑی آئی تب ہم وہاں سے نکلے۔ پھر دہلی سے پاکستان کے لئے روانہ ہوئے تو مہاجرین کے کیمپ میں ڈیڑھ ماہ تک پڑے رہے اور پانی میں نمک چھڑک کر پیتے رہے۔ پاکستان تک پہنچنے کے لئے ہمیں لاشوں سے گزرنا پڑا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے کتنے ہی انسانوں اور گھوڑوں کو راستے میں مرا پڑا دیکھا۔ اب بھی اگر ہم اپنے ملک پاکستان کی قدر نہ کریں تو یہ کتنے افسوس کی بات ہے۔ " مُنّی باجی بولتے بولتے افسردہ ہو گئیں۔ وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھیں۔ جس ملک کو بنانے کے لئے اتنی قربانیاں دینی پڑیں اگر اس کے بعد بھی اسی ملک کے لوگ میل محبت سے نہ رہیں تو یہ بد نصیبی ہی کی تو بات

ہے۔

"بچوں کی دنیا" کے ریڈیو پروڈیوسر پرویز اختر

"پاکستان آنے کے بعد میں نے دو ڈھائی سال تک ریڈیو اسٹیشن لاہور سے بچوں کا پروگرام کیا۔ پھر کراچی میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو یہاں سے پروگرام کرنے لگی۔"

"منّی باجی یہ بتائیے کہ پہلے اور آج کے بچوں میں آپ کو کیا فرق محسوس ہوتا ہے؟"

"ہاں پہلے بچے ریڈیو پروگرام کرنے کے شوق میں آتے تھے اب پیسے کے لئے آتے ہیں۔ ان میں ایسے بچے بھی ہوتے ہیں جن کی آواز اچھی نہیں ہوتی لیکن وہ لمبے لمبے سفارشی خط لیکر آجاتے ہیں۔"

منّی باجی کی بات سے پروگرام کے پروڈیوسر پرویز اختر کو اتفاق نہ تھا۔ کہنے لگے۔ "ایسا نہیں ہے۔ اب بھی بچے شوق ہی سے آتے ہیں۔ اگر شوق نہ ہوتا تو کرفیو کی سختی میں بچے پروگرام کرنے کبھی نہ آتے۔ صرف پیسے کے لئے کون اپنی زندگی خطرے میں ڈالتا ہے؟"

"لیکن آج کل کے بچے ماضی کے بچوں کے مقابلے میں ذہین تو ہوتے ہیں۔ یہ تو آپ بھی مانیں گی؟"

منی باجی ایک لمحے کے لئے چپ رہیں: "بھئی یہ ٹھیک ہے کہ آج کل ٹی وی کی وجہ سے بچّوں کی معلومات بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ ہم لوگوں کے زمانے میں تو طرح طرح کی پابندیاں تھیں۔ میرے پروگرام میں آج سے پچّیس تیس سال پہلے جو بچّے آتے تھے۔ اب تو وہ سب خود بچّوں والے ہیں۔ بڑے بڑے عہدوں پر ہیں۔ اب بھی وہ جب کہیں ملتے ہیں تو بڑے ادب سے۔ انہیں دیکھ کر مجھے یاد آجاتا ہے کہ جب وہ پہلی بار میرے پروگرام میں آتے تھے تو ان میں سے کسی کی آستین لٹک رہی ہوتی تھی اور کوئی شرم سے گردن جھکائے ہوتا تھا۔"

"آج بھی جب ہمارے پروگرام میں بچّے آتے ہیں" پرویز اختر بولے، "تو ہم چیک کر لیتے ہیں کہ کسی بچے کے ناخن یا بال بڑھے ہوئے تو نہیں ہیں۔ اگر کوئی بچّہ نظر آتا ہے تو ہم اسے سختی سے ہدایت کرتے ہیں کہ اگلی بار وہ ناخن اور بال ترشوا کر آئے ورنہ پروگرام میں اسے شریک نہیں ہونے دیا جائے گا۔ ہمارے پروگرام کا مقصد صرف تفریح نہیں بلکہ تربیت بھی ہے۔"

"منی باجی آپ کا پروگرام براہ راست نشر ہوتا ہے تو پچاس ساٹھ بچوں کو آپ کیسے کنٹرول کرتی ہیں۔ بچّے آپ کو تنگ تو نہیں کرتے؟"

"میں پروگرام کرتے وقت بہت بے مروت ہو جاتی ہوں۔ جہاں کوئی بچّہ شور مچاتا ہے یا شرارت کرنے لگتا ہے فوراً ڈانٹ دیتی ہوں...... "کھڑے ہو جائے فوراً...... چلو اسٹوڈیو سے نکلو۔" وہ سر جھکائے کھڑا ہو جاتا ہے۔ "مُنّی باجی۔ معاف کر دیجئے اب نہیں کروں گا۔ وعدہ"

پھر میں کہتی ہوں۔ "چلو بیٹھ جاؤ لیکن خبردار دوبارہ یہ حرکت نہ کرنا۔" اسی سختی کی وجہ سے پروگرام میں ڈسپلن قائم رہتا ہے۔"

"اچھا مُنّی باجی آخری سوال...... اتنی لمبی مدت تک یہ پروگرام کرنے کے بعد آپ کا دل اکتایا تو نہیں؟"

"کبھی نہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہر موسم کے ساتھ پروگرام تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ دوسرے بچّوں سے اور اس پروگرام سے مجھے اتنی محبت ہو گئی ہے کہ میں اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔"

ہاں واقعی انہیں بچّوں سے اتنی ہی محبت ہے اور شاید بچوں کو بھی ان سے اتنا ہی پیار ہے۔ مُنّی باجی جن کا اصلی نام پروین اختر ہے، جنھوں نے دہلی سے ادیب عالم کیا، انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی اور ایک ہزار سے زائد پروگراموں میں بچّوں کا کردار ادا کیا۔ ان کی خدمات کا آج تک سرکاری سطح پر اعتراف نہیں کیا گیا۔ یہ صرف مُنّی باجی نہیں اس ملک کے بچوں کے ساتھ بھی ناانصافی ہے۔

دلدل

حمید کاشمیری

اس دن جب راشد کی ماں اچانک سینہ پیٹتی ہوئی ویڈیو گیمز کی دکان میں داخل ہوئی تو تنگ گھٹی ہوئی اور راشد کی عمر کے نوجوان لڑکوں سے بھری ہوئی نیم تاریک دکان میں ایک قیامت برپا ہو گئی۔ ایسا منظر نہ تو پہلے کسی نے ویڈیو گیمز کی دکان میں دیکھا تھا اور نہ آس پاس بازار کے اندر کبھی ایسی بات ہوئی۔ راشد ویڈیو گیمز کھیلنے کے نشے میں بالکل اسی طرح گرفتار ہو گیا تھا جیسے راشد کا باپ رمضان ہیروئن کے نشے کا عادی بن گیا تھا۔ اس کے باپ پر بھی جب ہیروئن کی طلب کا دورہ پڑتا تو اس کی حالت قابل رحم ہو جاتی اور وہ ایک دم توڑتے انسان کی طرح کانپنے اور ایڑیاں رگڑنے لگ جاتا۔ کچھ ایسا ہی حال راشد کا اس وقت ہو جاتا جب اس پر ویڈیو گیم کھیلنے کا دورہ پڑتا اور اس کے پاس کھیل کا ٹوکن خریدنے کے لئے پیسے نہ ہوتے۔ اور وہ ماں سے لڑ کر یا گھر کی کوئی چیز فروخت کر کے ایک روپیہ کسی نہ کسی طرح حاصل کر ہی لیتا اور وہ ویڈیو گیمز کے ہر کھیل کے اندر اتنا ماہر ہو گیا تھا کہ ٹوکن ڈال کے کسی بھی مشین پر کھڑا ہو جاتا تو گھنٹوں ایک ٹوکن سے کھیل سکتا تھا اور اس طرح وہ بعض اوقات چار چار چھ چھ گھنٹے گھر سے غائب ویڈیو گیمز کی دکان میں کسی مشین کے ساتھ الجھا رہتا۔ جبکہ اس کا باپ رمضان

ہیروئن کے اڈے پر یا کسی فٹ پاتھ پر یا کہیں کسی پارک میں ہیروئن کے نشے میں یا ہیروئن کی طلب میں اوندھے منہ پڑا رہتا۔ اور راشد کی ماں اپنے بیٹے اور اپنے شوہر کی بُری عادتوں کی وجہ سے اپنے دن رات ایسے عذاب میں گذارتی جیسے چکّی کے دو پاٹوں کے درمیان کچلی جارہی ہو۔ شوہر اور بیٹا دونوں اس کے لئے ایک مستقل عذاب بن گئے تھے۔

اصل میں نشے کی بُری لت پہلے راشد کے باپ رمضان کو پڑی پھر راشد ویڈیو گیمز کی عادت میں مبتلا ہو گیا۔ جوں جوں اس کے گھریلو حالات بگڑتے چلے گئے وہ اپنی تعلیم سے ہٹتا چلا گیا۔ ورنہ وہ بنیادی طور پر بہت ہوشیار لائق اور ذہین طالب علم تھا۔ پہلی سے پانچویں جماعت تک اپنے اسکول میں اگر اوّل نہیں تو دوئم اور سوئم اور چہارم پوزیشن تو لے ہی آتا تھا۔ اس کا باپ رمضان بھی کسی بڑے آدمی کے پاس ٹھیک ٹھاک باور دی ڈرئیوار تھا۔ اچھی تنخواہ ملتی تھا اور اوپر سے ٹپ وغیرہ کی آمدنی بھی تھی جس سے گھر کے حالات بھی اچھے تھے اور راشد بھی بہت دلچسپی سے پڑھنے میں مصروف رہتا تھا۔ بلکہ بہت سے بچے راشد سے سیکھنے اور اس کے پاس پڑھنے آتے تھے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ رمضان غلط دوستوں کی صحبت میں پڑ کر ہیروئن کا عادی ہو گیا۔ اس کے نشے کے اخراجات بڑھتے بڑھتے اتنے زیادہ ہو گئے کہ گھر میں تنگی تُرشی ہونے لگی۔ راشد چونکہ اچھے اسکول میں پڑھتا تھا اس لئے اس کی فیس بھی ٹھیک ٹھاک تھی، لیکن گھر میں غربت آجانے کی وجہ سے دو دو مہینے تک وہ اسکول کی فیس ادا نہ کر پاتا۔ رمضان کے حالات بگڑتے چلے گئے۔ اتنے بگڑے کہ تنگ آکر اس کے مالک نے ایک دن اسے نوکری سے چھٹی دے دی۔ لیکن نوکری سے علیحدگی اسے ہیروئن سے چھٹّی نہ دلا سکی۔ وہ ہیروئن کے نشے میں مزید ڈوبتا اور آگے بڑھتا چلا گیا اور وہ اس نشے میں جتنا آگے گیا راشد اتنا ہی تعلیم میں پیچھے ہوتا گیا اور گھر میں اتنی ہی تباہی مچتی گئی۔ تھوڑی بہت جو جمع پونجی تھی وہ خرچ ہو گئی۔ راشد کی ماں کے زیوارت فروخت ہوئے کپڑے لتّے بکے۔ اڑوس پڑوس اور عزیزوں رشتہ داروں سے راشد کی ماں نے قرض لینا شروع کیا اور رمضان کے نشے کی ضروریات پوری کرتی رہی۔ نہ پوری کرتی تو رمضان بچوں کی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر روتا۔ گڑگڑانے لگتا۔ آنے جانے والوں سے بھیک مانگتا۔ گھر کے اندر توڑ پھوڑ کرنے لگتا۔ راشد اور اس کی ماں کی پٹائی کرتا اور آخر کار سکون اسے اس وقت ملتا جب اسے نشے کے لئے کہیں نہ کہیں سے پیسے مل جاتے۔ اس تمام صورت حال کا اثر رمضان کے گھر اور اس کے بیوی بچّوں پر بہت بُرا پڑا۔ راشد کی بہن فائزہ کا اسکول چھوٹ گیا اور وہ گھر بیٹھ کے بیمار پڑ گئی اور اسے ٹی بی ہو گئی اور فیس داخل نہ ہونے کے سبب راشد کا بھی دو مرتبہ اسکول سے نام کٹ گیا۔ دونوں مرتبہ اس کی ماں نے جوں توں کر کے رقم جمع کرائی اور ایک بار پھر راشد کو اسکول میں داخل

کرایا۔ لیکن راشد کی پڑھائی کا گراف نیچے ہی نیچے آتا چلا گیا۔ کہاں تو وہ اوّل، دوئم اور سوئم آتا تھا کہاں دو دو تین تین پرچوں میں فیل ہونے لگا اور اسے پڑھائی سے زیادہ ویڈیو گیمز کھیلنے میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اور اس دلچسپی نے اسے تباہی کے دہانے پر کھڑا کر دیا۔

راشد کے گھر میں آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں رہا تھا۔ عزیزوں رشتہ داروں نے منہ موڑ لیا تھا۔ جن سے قرض کی امید تھی ان کے گذشتہ قرض ہی ابھی نہیں چُکائے گئے تھے۔ گھر کا تمام قابل فروخت سامان بک چکا تھا اور اب راشد کی ماں لوگوں کے کپڑے دھو کر برتن مانجھ کر اور محنت مشقّت کر کے بمشکل گھر کی گاڑی چلاتی...... اسی آمدنی میں سے وہ رمضان کا نشہ بھی پورا کرتی اور اسی آمدنی میں سے راشد بھی لڑ بھڑ کر روپیہ دو روپے لے جاتا اور اپنی ماں کے خون پسینے کی کمائی کو ویڈیو گیمز کی مشینوں میں ڈال دیتا۔ ماں راشد کی منّتیں کرتی سمجھاتی بجھاتی اور کہتی۔

"دیکھو بیٹا تمہارا باپ اب عادی نشے باز اور لاعلاج بیمار ہو گیا ہے۔ اب ہمارا مستقبل تم ہی تو ہو۔ کچھ کرو گے تو تمہاری بھی زندگی بنے گی اور ہم بھی زندہ رہیں گے" لیکن ساری نصیحتیں لاحاصل ہو گئی تھیں۔ راشد کسی بات پر کان نہیں دھرتا تھا۔ اس کے دماغ پر ویڈیو گیمز کے سوا اور کوئی چیز سوار نہیں تھی۔ وہ لڑ بھڑ کے ماں سے ایک دو روپے لے ہی جاتا اور دو ٹوکن بھی اگر اس کے ہاتھ آجاتے تو اب اسے اتنی مہارت ہو گئی تھی کہ ایک دو ٹوکنوں کے سہارے وہ کئی کئی گھنٹے ایک گیم کو لمبا کر سکتا تھا۔ اور بعض اوقات ویڈیو گیمز کی دکان کے اندر اس کی طویل موجودگی دکان کے مالک کے لئے بھی مفید ثابت ہوتی۔ وہ یوں کے اکثر نئے اور اناڑی کھلاڑی لڑکے گیمز کھیلنے ویڈیو سینٹر میں آتے جنہیں کھیلنا نہیں آتا تھا اور راشد ان کی رہنمائی کرتے ہوئے ان کی مدد کرتا اور گیم کھیلنے اور کنٹرولر کو ہینڈل کرنے کے طریقے بتاتا۔ اس طرح دکاندار کی یہ مدد ہوتی کہ نو آموز لڑکے سیکھتے اور اس کے مستقل گاہک بن جاتے۔ انہیں راشد کی طرف سے کھیلنے کی تربیت بھی ملتی اور راشد کا اپنا جنون کی حد تک بڑھا ہوا شوق بھی پورا ہو جاتا اور وہ زیادہ سے زیادہ وقت ویڈیو گیمز کی دکان کے اندر گذار سکتا۔

محلے والے اسے نصیحت کر چکے تھے۔ کئی بار عزیز و اقارب نے اسے سمجھایا بُرا بھلا کہا۔ اس کی ماں کئی بار اسے کان سے پکڑ کر لے گئی۔ کئی بار اس نے راشد کو ویڈیو گیمز کی دکان کے اندر تمام لڑکوں کی موجودگی میں پیٹا، جوتے مارے اور گھسیٹتی ہوئی لے کر گھر آئی، لیکن دوسرے ہی دن یا

تھوڑی دیر بعد جب بھی راشد کو موقع ملتا وہ واپس ویڈیو گیمز سینٹر کے اندر آن موجود ہوتا۔ جس طرح اس کا باپ ہیروئن کے نشے کا لاعلاج مریض ہو گیا تھا اسی طرح راشد بھی ویڈیو گیمز کے نشے کا ایک لاعلاج عادی بن گیا تھا اور اس کی مظلوم ماں نے اسے قدرت پر چھوڑ دیا تھا کہ اب کوئی معجزہ ہی اسے راہِ راست پر لا سکتا ہے۔ اس نے ایک دفعہ ویڈیو گیمز کے مالک سے بھی درخواست کرتے ہوئے کہا کہ۔

"بیٹا تم اس کو یہاں آنے سے روکو۔ خدا تمہارا بھلا کرے گا۔ اس ایک گاہک کے نہ ہونے سے تمہارے کاروبار پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑے گا۔ تمہارے پاس بہت گاہک ہیں۔ بہت کام ہے تمہارے پاس، بھری ہوئی ہے دکان لڑکوں سے اگر یہ لڑکا......"

"سنو سنو ماں جی۔ میری بات سنو......" دکاندار نے راشد کی ماں کی بات کاٹتے ہوئے نہایت ہمدردی سے کہا۔ وہ کہنے لگا

"اگر آپ بولیں گی تو میں آپ کے بیٹے کو دکان میں گھسنے نہیں دوں گا۔ لیکن اس سے فائدہ کچھ نہیں ہوگا۔ وہ اس دوکان کو چھوڑ کر کہیں اور کسی دوسری دوکان میں چلا جائے گا۔ جو یہاں سے دور بھی ہوگی اور آپ کو پتہ بھی نہیں ہوگا کہ بیٹا آپ کا کہاں ہے۔ آپ اس کو ڈھونڈتی رہ جائیں گی۔"

"ٹھیک کہتے ہو بیٹے......" راشد کی ماں نے دوکاندار کی بات کو سمجھتے ہوئے سرہلایا۔ اور قائل ہوتے ہوئے مزید کہنے لگی۔ "ٹھیک کہتے ہو بیٹے۔ ٹھیک کہتے ہو۔ یہاں مرن جوگا آنکھوں سے اوجھل تو نہیں ہے ناں۔" بس پھر اس کی ماں جھولی پھیلا کر بددعائیں دیتی ہوئی ویڈیو سینٹر سے واپس چلی گئی۔ وہ جاتے جاتے بددعائیں دیتی جا رہی تھی اور کچھ پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ بددعائیں کس کو دے رہی ہے۔ لہٰذا وہ رات کے بارہ بارہ بجے تک ویڈیو دوکان کے اندر گیمز کھیلنے میں مصروف رہتا۔ راشد کو۔ راشد کے باپ رمضان کو۔ ان لوگوں کو جن کی صحبت میں رمضان اور راشد غلط راہ پر چل کر برباد ہوئے ہیں یا وہ اپنی قسمت کو بُرا بھلا کہہ رہی ہے۔ بہرحال اس دن وہ راشد کو کوسنے دیتے ہوئے ویڈیو کی دکان سے چلی گئی اور راشد کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ پھر وہ کئی مہینے تک راشد کو ڈھونڈنے ویڈیو شاپ کی طرف نہیں آئی اور راشد نے بھی یہی سمجھ لیا کہ اب اس کی ماں شاید اسے ڈھونڈنے کبھی نہیں نکلے گی، لیکن پھر اس دن تو جیسے قیامت ہی برپا ہو گئی۔ جب راشد کی ماں اچانک سینہ پیٹتی ہوئی ویڈیو کی دوکان میں داخل ہوئی۔ وہ دھڑا دھڑا اپنی چھاتی پیٹ رہی تھی اور بال نوچ رہی تھی۔

"کہاں ہے یہ مرن جو گا۔ " اس نے اپنے دونوں ہاتھ چھت کی طرف بلند کر کے واویلا مچایا اور پھر دوہتڑ اپنے سینے پر مارے۔ دوکاندار کے سر کو کوٹا۔ جو لڑکے اس وقت ویڈیو کھیل رہے تھے ان سب کے سروں پر دوھتڑ مارتے ہوئے بین کرنے لگی

"خانہ خرابو۔ مر جاؤ تمہارا کوئی نہ رہے۔ کوئی نہیں ہے تمہارا آگے پیچھے۔ تمہیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں ہے دنیا میں۔ سب راشد کی طرح یتیم ہو گئے ہو۔ " پھر اس کی اچانک نگاہ راشد پر پڑی جو ماں کے خوف سے دوکان کے ایک کونے میں دبکتا جا رہا تھا

"اِدھر آ بدبخت...... " اس نے راشد کو گریبان سے پکڑا اور چلّا چلّا کے بولنے لگی "تیرے باپ کی لاش آئی ہے گھر میں...... " اس نے جنون کی حالت میں راشد کو جھنجھوڑا۔ "وہ سڑک پر مرا ہوا پڑا تھا" اب بول کیا کروں میں۔ اسے اِدھر لاؤں تو اُدھر آئے گا۔ بول بول کمینے بول۔ "

"اماں ...... کیا ہوا بابا کو" راشد ایک دم دہل گیا۔

"مر گیا ہے تمہارا باپ ابھی ابھی لاش آئی ہے اس کے گھر میں۔ اس کی ماں پاگلوں کی طرح بولی اور کہنے لگی "میں تجھے بُلانے نہیں آئی ہوں۔ صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ کیا جنازہ ادھر سے گذاریں یا سیدھا قبرستان لے جائیں۔ " راشد نے جب ماں کے منہ سے یہ الفاظ سنے تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"ایسا نہ بول اماں...... "اس نے ماں کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے اور پھر ماں کے قدموں کو چھو کر کہنے لگا

"تو کہا کرتی تھی ناں ماں کے قدموں میں جنت ہے۔ میں تیری انہیں قدموں کی اور اس جنت کی قسم کھا کے کہتا ہوں۔ اب تو مجھے کبھی ویڈیو گیمز کی دکان میں نہیں دیکھے گی۔ اس کے بعد پھر ویڈیو گیمز کی دکان میں جانا یا ویڈیو کھیلنا تو درکنار کسی نے راشد کو ویڈیو گیمز کی دوکان کے سامنے سے گذرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ یہ اس کی زندگی میں ایک نیا موڑ تھا جو باپ کی موت سے آیا۔

...... ○○○ ......

رحمت مستری رمضان ڈرائیور کا بہت گہرا اور مخلص دوست تھا۔ وہ رمضان کی بیماری کے دوران بھی رمضان کی بہت مدد کرتا رہا۔ اسے کئی بار نقد رقم بھی دی۔ کئی بار اسے ڈاکٹروں کے پاس اسپتالوں میں لے گیا۔ اس کا علاج معالجہ کرانے کی کوشش کی لیکن رحمت مستری کی بھی یہ ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور آخر کار رمضان کا انجام اسکی عبرت ناک موت پر ہوا۔

باپ کی موت کے بعد راشد میں بہت تبدیلی آئی۔ وہ دوبارہ پڑھ تو نہیں سکا۔ لیکن اس نے مستری رحمت کے گیراج پر بہت محنت اور دلچسپی سے کام سیکھنا شروع کیا۔ چونکہ راشد کا باپ ڈرائیور تھا اور جن دنوں وہ نشے کا عادی نہیں تھا اور راشد بھی ویڈیو گیمز کے چکر میں نہیں پڑا تھا تو راشد کا بہت سا وقت باپ کے ساتھ اس کی گاڑی میں گذرتا تھا۔ جہاں اس نے باپ سے گاڑی کو جیک لگانا۔ ٹائر بدلنے، نٹ بولٹ کسنے۔ پلگ صاف کرنے اور چھوٹی موٹی میکانکی کے ساتھ اپنی کم عمری کے علاوہ باپ سے ڈرائیونگ بھی سیکھ لی تھی اور یہ ساری باتیں اسے مستری رحمت کے کارخانے پر بہت کام آئیں اور رحمت نے پہلے دن سے روٹی چائے کے علاوہ دس روپے روزانہ کا محنتانہ مقرر کر دیا۔ اس طرح جمعرات کو اسے ساٹھ ستر روپے نقد مل جاتے جو وہ اپنی غمزدہ اور دکھی ماں کے قدموں میں رکھ دیتا۔

راشد کا گھر بفرزون کے پاس تھا اور مستری رحمت کا کارخانہ کافی دور میوہ شاہ قبرستان کے کنارے واقع تھا اور گیراج سے گھر کا سفر کرنے کے لئے راشد کو تقریباً دو بسیں بدلنی پڑتی تھیں اور کم و بیش دو گھنٹے سفر میں لگ جاتے تھے۔ پھر ایک دن مستری رحمت نے اسے مشورہ دیا کہ وہ کیوں نہ رات کو گیراج پر ہی سو جایا کرے۔ اس طرح اس کے آنے جانے میں جو دو گھنٹے لگتے ہیں اور دو بسیں بدلنی پڑتی ہیں اس پریشانی سے بھی بچے گا اور بس کے کرائے کے پیسے بھی بچا لے گا۔ راشد کو بھی یہ مشورہ پسند آ گیا۔ لیکن راشد کی ماں جو راشد کی طرف سے اب کچھ سکون میں تھی فکر مند ہونے لگی۔

"بیٹا میں اب تمہیں اپنی آنکھوں سے دور نہیں رکھنا چاہتی ہوں۔"

"ماں جی ہم ایک ہی شہر میں ہیں۔ کوئی دور نہیں ہیں" راشد نے ماں کو سمجھایا پھر ماؤں کے بیٹے تو آجکل وطن سے ہزاروں میل دور روزگار کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ میں جمعرات کو شام کو آجایا کروں گا اور جمعہ کا دن تمہارے پاس گذار کر ہفتے کی صبح واپس چلا جایا کروں گا۔" پھر راستے میں آئے دن کرفیو لگا رہتا ہے اس سے بھی نجات ملے گی۔" ماں کو راشد کی اس بات نے کچھ قائل کیا۔

"یہ میری نگرانی میں ہے بہن۔ تم اس کی فکر نہ کرنا" جب رحمت نے بھی تسلی دی تو ماں بھی راشد کے گیراج میں رہنے پر رضامند ہو گئی۔ یوں تو راشد کو گیراج پر کام کرتے کئی مہینے ہو گئے تھے لیکن جب اس کی پہلی رات گیراج پر آئی تو اس نے محسوس کیا کہ دن تو ٹھیک ہے لیکن گیراج پر رات گذارنا اس کے لئے بہت مشکل ہے۔ خاص طور پر پہلی رات جو کسی طرح اسے کٹتی دکھائی نہیں دے رہی تھی!۔

......OOO......

گیراج قبرستان کے بیچ میں واقع تھا اور اس کے چاروں جانب قبریں ہی قبریں تھیں ۔ ایک پکی سڑک تھی جو منگھوپیر کی جانب سے آتی اور قبرستان کے بیچوں بیچ سے نکل کر دھوبی گھاٹ سے گذرتی ہوئی شیر شاہ روڑ پر لیاری کے وسط میں جاملتی تھی۔ اس کچی سڑک پر ٹریفک بھی کم تھی اور ایسی گاڑیاں چلتی تھیں جو کسی خاص ضرورت کے تحت اس طرف سے گذر رہی ہوں۔ چلنے والی گاڑیوں میں زیادہ تعداد پرانے اور ریتی بجری کے ٹرکوں کی تھی۔ کبھی کبھی کوئی میّت گاڑی جنازہ لے کر نکل جاتی یا سڑک کے کنارے پر کسی جگہ رک جاتی اور میّت کی چارپائی کو لوگ کندھوں پر اٹھا کر دور اندر قبرستان میں لے جاتے۔ یہ شہر کا بہت پرانا اور تاریخی قبرستان تھا جہاں قبر کی کوئی جگہ باقی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود ہر روز نئے مردے کے لئے اس میں گنجائش نکل آتی تھی یا گورکن کسی پرانے مردے کی قبر صاف کر کے نئے کی جگہ نکال لیتے تھے۔ تاہم مستری رحمت کا یہ گیراج اسی قبرستان والی سڑک کے کنارے ایک عرصہ سے قائم تھا اور مستری کی مہارت کے ساتھ اور اثر رسوخ کی وجہ سے کام ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا اور جما ہوا تھا۔ لیکن راشد کو اس بات کا احساس نہیں تھا کہ رات کے وقت یہ جگہ اس قدر پر ہول اور آسیب زدہ ہو جاتی ہوگی۔ کیونکہ دن میں تو یہاں کافی آمدورفت ہوتی ہے اور کچھ رونق کا احساس ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا سا کھلی چھت کا چائےخانہ بھی ہے تھوڑی بہت دوکانیں، خستہ سے اسٹور بلاک بنانے کا ایک چھوٹا سا دستی کارخانہ۔ گائے، بکریاں، بھینس، پھول بیچنے والوں کے کیبنوں کی قطاریں اپنے مردوں پر فاتحہ پڑھنے کے لئے آنے والوں کی گاڑیاں اور کچی بستی سے آنے جانے والے اکا دکا لوگوں اور کچی بستی سے نکل کر آتے اور قبرستان کے اندر کھیلنے والے بچوں کی وجہ سے رونق سی رہتی تھی۔ لیکن شام ہوتے ہی یہ ساری رونق ختم ہو گئی۔ ٹوٹا پھوٹا خستہ سا بازار بند ہو گیا۔ بلاک بنانے والے مزدور بھی چلے گئے۔ گائے بکریوں اور بھینسوں کو ان کے مالکان کھول کر لے گئے۔ بچے بھی کچی بستی کے دڑبوں میں گھس گئے۔ سڑک پر گذرنے والی اکا دکا ٹریفک بھی تقریباً بند ہو گئی اور جوں جوں اندھیرا پھیلتا گیا ماحول زیادہ آسیب زدہ ہو گیا۔ گیراج پر راشد کے ساتھ کام کرنے والے تین لڑکے اور بھی تھے۔ جن کے نام اکو، اسلم اور گولا تھے۔ چاروں نے شام کو ہی برابر والے کھوکھے سے کھانا کھالیا وہ یہاں قبرسان کے اندر رات بسر کرنے کے عادی تھے۔ لیکن راشد اپنے ماضی کی تمام لاابالی اور نٹ کھٹ زندگی کے باوجود رات کی آسیب زدہ زندگی سے بہت خوف زدہ ہو گیا کیونکہ اس نے اس سے پہلے رات قبرستان میں کبھی بسر نہیں کی تھی۔ اس کے اندر ہی اندر وقفے وقفے سے ایک جھرجھری سی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ آخر کار اٹھ کے بیٹھ گیا۔

(باقی آئندہ)

"بچوّں کا ہفتہ" کے اعلان کے بعد ایک شرارتی بچے کے تاثرات

اس ہفتے

شہنواز فاروقی

کرنا ہوگا وہی آپ کو جو اب میں کرواؤں گا
ابّو صاحب اِس ہفتے میں آپ پہ حکم چلاؤں گا

جاؤں گا ہر روز آپ کے اب تو میں دفتر پپّا
بھیجوں گا اسکول آپ کو کاندھے سے لٹکا بستہ
آدھی نیکر اپنے جیسی آپ کو میں پہناؤں گا
ابّو صاحب اس ہفتے میں آپ پہ حکم چلاؤں گا

یار دوستوں کے سنگ گپّیں میں زوروں سے ہانکوں گا
"چُپ بیٹھو یا باہر کھیلو" کہہ کر آپ کو ڈانٹوں گا
کپڑے میلے اگر کئے تو آپ کو مرغ بناؤں گا
ابّو صاحب اس ہفتے میں آپ پہ حکم چلاؤں گا

سگریٹ پی تو چھ ہفتے تک آپ سے میں نہ بولوں گا
ذرا دیر سے گھر آئے تو دروازہ نہ کھولوں گا
شام ڈھلے کتّے کو باہر اب میں خود ٹہلاؤں گا
ابّو صاحب اس ہفتے میں آپ پہ حکم چلاؤں گا

اس ہفتے ہر حکم پہ میرے عمل مسلسل ہونا ہے
میرے کہنے پر اٹھنا، میرے کہنے پر سونا ہے
آنا کانی اگر ذرا کی فوراً سبق سکھاؤں گا
ابّو صاحب اس ہفتے میں آپ پہ حکم چلاؤں گا

Without a shadow of doubt
دھنک کے رنگ لذت کے سنگ
قومی مشروب
نورس کیا خوب
Naurus
Naturally
National

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں

روئی سے
بنی ہوئی
اس مچھلی
کا نام ہے
جاز-۳

جاز ۳

وولف مین

مسکراتے ہوئے
چھال کے ٹکڑے
اور صنوبر کے خشک
پھول سے مل کر
بنا وولف مین

ناریل کے خشک ٹکڑے
چند سیپیاں اور کچھ
پرانے سے تار
اور ایک تخلیقی ذہن نے
مل کر بنائے چوہے چار

کدو سے بنا
کدو ہی لگا
دو کدو - چند ٹہنیاں
ایک ٹوپی اور ایک لڑی
پھر بھی رہا کدو کا کدو

سڑک کے کنارے چلتے ہوئے ہمیں کتنی ہی بے کار چیزیں پڑی ہوئی نظر آتی ہوں گی۔ کوئی پتھر کا ٹکڑا، کوئی ٹوٹی ہوئی لکڑی، کاغذ کے پُرزے، گتے کی ڈبیہ یا کچھ اور .... مگر ہم لوگ ان تمام چیزوں سے بے نیاز بس اپنی دھن میں مگن وہاں سے گزر جاتے ہیں اور کبھی غور نہیں کرتے کہ انہی چیزوں میں سے بیشتر چیزوں کو ذرا سی ذہانت سے کار آمد بھی بنایا جاسکتا ہے۔

امریکی باشندے ڈاکٹر جیمس گولڈن ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کھلی آنکھوں اور بند ذہنی کے ساتھ کہیں سے گذر جائیں بلکہ ان کی عادت تو یہ ہے کہ وہ چلتے پھرتے ہر چیز کو بغور دیکھتے ہوئے گذرتے ہیں۔ پلاسٹک کی ایک تھیلی ہر وقت ان کی جیب میں موجود ہوتی ہے۔جہاں انہیں اپنے مطلب کی کوئی چیز نظر آئی، وہیں انہوں نے اسے اٹھایا اور تھیلی میں ڈال کر گھر لے آئے۔ ایک روز پہاڑی راستوں پر سفر کرتے ہوئے انہیں ایک پتھر نظر آیا۔ اس پتھر کو ہزاروں لاکھوں لوگوں نے اس سے قبل بھی دیکھا ہو گا مگر یہ خیال صرف جیمس گولڈن ہی کو آیا کہ یہ پتھر انسانی شکل سے بہت مشابہہ ہے۔ گولڈن وہ پتھر اٹھا کر گھر لے آئے۔ پتھر میں منہ کی جگہ ایک سوراخ پہلے سے موجود تھا۔ البتہ ناک کی جگہ جو ایک چھوٹا سا چھید تھا۔ انہوں نے اس میں ایک لکڑی ڈال کر اسے باقاعدہ ناک بنا ڈالا۔ پھر آنکھوں کی جگہ دو خشک رس بریاں لگائیں اور سر پر گھاس پھوس کو یوں رکھ دیا جیسے وہ اس کے بال ہوں۔ لیجئے ہینگ لگی نہ پھٹکری اور چند لمحوں میں بغیر کسی خرچ کے ایک تخلیق عمل میں آگئی۔

ڈاکٹر گولڈن کہتے ہیں "مجھے سرراہ پڑی ہوئی چیزیں یوں اٹھالینے سے نہ تو شرمندگی ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی جھجک۔" انہوں نے اب تک چار ہزار سے زیادہ ایسی چیزیں بنائی ہیں جو فن تخلیق کا حسین نمونہ اور انکی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ان چیزوں میں جو انہوں نے بنائی ہیں، جادو گرنیاں، چوہے، بلیاں، بڑے بڑے اژدہے، کارٹون نما چہرے اور مختلف تزئین کی چیزیں شامل ہیں۔ وہ کہتے ہیں "میری کوشش ہوتی ہے کہ مجھے ان چیزوں کی تیاری کے لئے کچھ خریدنا نہ پڑے اور اگر مجبوری میں کچھ خریدنا پڑ بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ چند کاغذ، ایک رسی، روئی یا چند موتی بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

یہاں رنگین صفحے پر ہم نے ان کی بنائی ہوئی چند چیزوں کی تصاویر شائع کی ہیں۔ آپ بھی دیکھئے اور کوشش کیجئے کہ آپ اس سے بہتر کچھ بنا سکیں۔

ایسا کرنے سے آپ مالدار تو نہیں ہوجائیں گے البتہ تخلیقی کام کرنے کی جو عادت آپ کو پڑ جائے گی وہ آپ کو اچھے اور نت نئے خیالات سے مالا مال کر دے گی۔ ایسے خیالات جو مستقبل میں آپ کی بڑی کامیابیوں کی بنیاد بن سکتے ہیں۔

فرض

محمد سلیم مغل

تحریکِ آزادئ کشمیر کے حوالے سے ایک تاثراتی کہانی

" جلدی سے بتایئے پھر کیا ہوا ...... ؟"

امی کہانی سناتے سناتے ذرا سی دیر کے لئے رکیں تو شوکت نے بے چینی سے پوچھا ......

ہاں تو پھر ہوا یوں کہ گلاب سنگھ کے آدمیوں نے اننت نگر کی مسلمان بستی پر حملہ کر دیا ...... مکانوں کو آگ لگا دی ...... قیمتی سامان لوٹ لیا اور بہت سے لوگوں کو جان سے مار دیا ......

" تو کوئی مسلمان زندہ نہیں بچا ......" ؟ شوکت نے ایک بار پھر بڑی بے تابی سے پوچھا ......

نہیں بیٹا ...... بہت سے لوگ بچ گئے ...... لوگوں نے بھاگ کر اپنی جانیں بچائیں مگر ایسا تو شاید ہی کوئی ہو جس کا کوئی نہ کوئی رشتے دار نہ مرا ہو ......

بہت سے لوگ اپنے عزیزوں کے بچھڑنے کا داغ سینے پر لئے، لٹے پٹے ادھم پور کی طرف آ گئے اور

یہاں آکر آباد ہو گئے ......

امی یہ بتائیے کہ ادھم پور میں گلاب سنگھ کے لوگ مسلمانوں کو کچھ نہیں کہتے تھے کیا؟
بیٹا کہتے کیوں نہیں تھے ...... بہت تنگ کرتے تھے ...... ادھم پور کیا پورے کشمیر ہی میں ان کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ اچھا نہ تھا مگر مسلمان کر بھی کیا سکتے تھے ...... بیچارے غریب لوگ تھے نہ ان کے پاس اسلحہ تھا نہ کچھ اور ......

شوکت نے ایک بار پھر امی کی بات کاٹی اور پوچھا ......
"آخر کیا دشمنی تھی گلاب سنگھ کی مسلمانوں سے ؟"
"دشمنی یہی تھی کہ وہ مسلمانوں کو غلام بنا کر رکھنا چاہتا تھا اور مسلمان اس غلامی کے لئے تیار نہ تھے"

"اچھا امی یہ بتائیے کہ آپ اور ابو بھی اننت نگر کے فساد میں موجود تھے ...... ؟"
ہم لوگ اس وقت تھے ہی کہاں۔ یہ تو بہت پرانی بات ہے ...... جو دادا پردادا سے چلی آ رہی ہے ...... ہم نے تو صرف سنا ہی سنا ہے ، یہ بھی سنا ہے کہ اس حملے میں ہمارے بہت سے بزرگ شہید ہو گئے تھے ......"

امی نے اپنی بات ختم کی اور کسی کام کے ارادے سے اٹھ کر چلی گئیں ......"
شوکت دیر تک بستر پر لیٹا چھت کی طرف گھورتا رہا ...... نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی امی نے جو سچا واقعہ اسے آج کہانی کی جگہ سنایا تھا اس کا ایک ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا اس کا بس چلتا تو وہ اسی وقت جا کر گلاب سنگھ کا گن گانے والوں کو تہس نہس کر دیتا مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا اس لئے کہ ابھی وہ چھوٹا تھا یہی کوئی نو یا دس برس ہو گی اس کی عمر مگر آزادی کی کہانیوں اور واقعات کا وہ اتنا اثر قبول کر چکا تھا کہ اسے کچھ اور سوجھتا ہی نہیں تھا بس ہر وقت آزادی کی باتیں۔ آزادی کی جنگ اور آزادی کے نغمے۔ یہی اس کا موضوع تھا اور یہی اس کا مشغلہ بھی
وہ اپنے دوستوں کے ساتھ گھر سے باہر نکل جاتا چنار کے اونچے درختوں پر چڑھ کر اس کی ٹہنیاں توڑتا پھر ان سے ٹیڑھی میڑھی تلواریں بناتا اور دوستوں کو کہتا کہ آؤ "جنگ جنگ" کھیلیں ...... اس کھیل میں وہ اکثر جیت جاتا اور پھر خوشی سے پھولے نہیں سماتا ...... یہ ساری باتیں اس زمانے کی ہیں جب دسری جنگ عظیم اپنے عروج پر تھی اور اتحادی فوجیں مغربی جرمنی سے برسرپیکار تھیں۔
شوکت یہ بھی جانتا تھا کہ برصغیر کے مسلمان اپنی آزادی اور ایک علیحدہ ملک کے لئے کوشش کر رہے

ہیں جب کبھی اس کے ابو اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر ہندوستان کی آزادی کی باتیں کرتے تو وہ بھی ان باتوں کو بڑی توجہ سے سنا کرتا تھا۔ یہ بات بھی اسے ابو کے ایک دوست سے پتہ چلی تھی کہ انگریزوں نے کشمیر کو چند لاکھ روپوں کے عوض گلاب سنگھ ڈوگرہ کو دے دیا تھا......

شوکت نے ایک بار پھر اپنی امی سے کہا...... امی آپ نے مجھے حضرت معاذ اور معوذ کا سچا واقعہ سنایا تھا نا؟

ہاں سنایا تھا...... امی نے اثبات میں سر ہلایا......

اگر وہ دو بچے ابو جہل کو قتل کر سکتے تھے تو پھر میں دشمن سے کیوں نہیں لڑ سکتا......؟

لڑ لینا دشمن سے جب ذرا بڑے ہو جاؤ۔ مگر ابھی تو معاف ہی رکھو ہمیں......

امی کا یہ جواب اسے اچھا نہیں لگا اور وہ روہانسا سا ہو کر گھر سے باہر چلا گیا......

شوکت کے ابا کشتواڑ کے ایک سرکاری آفس میں ملازم تھے، کشتواڑ چونکہ ادھم پور سے کچھ دور تھا اس لئے ہر روز آنا جانا تو ممکن نہ تھا البتہ وہ ہفتے میں ایک بار گھر کا چکر ضرور لگا لیتے۔ شوکت کے ابا "شیخ جی" کے نام سے مشہور تھے اور پورا محلّہ ان کا بہت تعظیم کیا کرتا شیخ جی کو اپنے بیٹے شوکت پر بڑا فخر تھا اور وہ ہر ایک سے یہی کہتے کہ "دیکھنا ہمارا بیٹا شوکت ایک دن آزادی کا ہیرو بنے گا اور سب اس پر ناز کریں گے" ......

سننے والے شیخ جی کی اس بات پر انشاء اللہ کہتے اور دعاؤں کے ساتھ ان کا دل بڑھاتے۔

وقت دبے پاؤں گذرتا رہا، وقت کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں آزادی کی تحریک زور پکڑتی گئی......

اس تحریک کے اثرات کشمیر تک بھی پہنچ چکے تھے...... ادھم پور کے علاقے میں تو جیسے تحریک کی ذمہ داری شوکت کو سونپ دی گئی ہو۔ وہ دن رات کام کرتا بلکہ اب تو اس نے محلے کے بہت سے لڑکوں کو ساتھ مل کر ایک تنظیم بھی بنا ڈالی تھی جس کا نام "تنظیم آزادی" تھا۔

آزادی کی تحریک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی اور اس کی بازگشت پورے ہندوستان میں سنائی دے رہی تھی بچے بچے کی زبان پر یہ نعرہ تھا......

بٹ کے رہے گا ہندوستان — لے کے رہیں گے پاکستان

جا بجا پاکستانی پرچم نظر آنے لگے تھے اور اب یقین ہو چکا تھا کہ آزادی کی شمع آج یا کل میں روشن ہونے والی ہے۔

بالآخر پاکستان بن ہو گیا...... ریڈیو سے آزادی کا اعلان کیا گیا...... یہ بھی بتایا گیا کہ "مسلم اکثریت والے علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے اور کشمیر بھی پاکستان کا حصہ ہو گا" یہ خبر وادئ کشمیر میں خوشی کے ساتھ سنی گئی چونکہ کشمیر پاکستان کا حصہ بننے والا تھا اس لئے سبھی خوش تھے مگر شوکت کا حال سب سے مختلف

تھا۔ خوشی سے اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ مگر پھر یکایک یہ خبر آئی کہ کانگریسی راہنماؤں کی نیت میں فتور آگیا ہے اور وہ کشمیر کو بھارت کے ساتھ ملانا چاہتے ہیں دیکھتے ہی دیکھتے یہ مسئلہ ایک بڑے معرکے کی شکل اختیار کر گیا یہاں تک کہ دسمبر کے مہینے میں سرحد کے قبائلیوں اور دیگر مسلمانوں نے جہاد کا اعلان کر دیا

شوکت نے جہاد میں با قاعدہ حصہ لینا چاہا اور اجازت کے ارادے سے اپنے والد کے حضور پیش ہوا۔ ''تمہیں اجازت نہیں مل سکتی'' ...... یہ شیخ جی کا حتمی جواب تھا تم ایک ہی تو بیٹے ہو ہمارے ...... تمہیں کچھ ہو گیا تو ہم کہیں کہ نہ رہیں گے ...... خدارا جہاد پر جانے کی ضد چھوڑ دو۔

اس لمحے شوکت کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ ساری کہانیاں جھوٹی تھیں جو بچپن میں ماں اسے آزادی سے حوالے سے سنایا کرتی تھی۔ اسے آزادی کے نغموں سے بھی چڑ سی ہونے لگی۔

اسے اپنے سارے خواب ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوئے مگر اس نے ضد نہ چھوڑی ...... سرحد سے خبریں آ رہی تھیں کہ مسلمان فتوحات حاصل کر رہے ہیں اور عنقریب پورا کشمیر فتح ہو جائے گا...... ہر خبر کے ساتھ ہی اس کی بے چینی بھی بڑھ جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہ کسی طرح اڑ کر محاذ پر چلا جائے اور انتقام کی اس آگ کو ٹھنڈا کرے جو بچپن سے اس کے ذہن میں بھڑک رہی تھی ...... وہ اکثر کہتا تھا کہ میں ٹھاکروں سے چن چن کر بدلے لوں گا ...... گلاب سنگھ سے لے کر آج تک تمام کے قرض چکاؤں گا مگر جب قرض چکانے کا وقت آیا تو ابا جی نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں...... شوکت چونکہ شروع ہی سے ماں باپ کا فرمانبردار اور سعادت مند بیٹا تھا اس لئے زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکلی جس سے ابا کی دل آزاری ہو مگر وہ اندر ہی اندر کڑھتا اور جلتا رہا...... پھر یہ خبر آئی کہ جنگ رکوا دی گئی ہے اور اب کشمیر کی قسمت کا فیصلہ اقوام متحدہ کے ایوان میں ہو گا...... یہ خبر کیا آئی گویا قیامت ٹوٹ پڑی شوکت اور اس کے اہل خانہ کشمیر کے اس حصے میں رہ گئے تھے جو بھارت کے قبضے میں تھا آزادی کی منزل سے چند کوس دور اور غلامی کے گھنے جنگل میں۔ شوکت کی امیدوں نے ایک ایک کر کے دم توڑ دیا اور اسے تو بس جیسے لمبی چپ لگ گئی ہو وہ کسی سے بات نہ کرتا اور تنہائیوں میں بیٹھ کر خلا میں یوں گھورتا رہتا جیسے اس کا کچھ کھو گیا ہو...... گھبرو جوان کی یہ حالت ماں اور باپ سے دیکھی نہیں جاتی تھی مگر وہ بھی کچھ نہ کر سکے ...... انہوں نے اس بیٹے کو کھو دیا تھا جس کا رواں رواں آزادی کے خواب دیکھا کرتا تھا اور جس کا لمحہ لمحہ آزادی کے حصول کی کوششوں میں گذرتا تھا وقت گذرتا رہا...... لیل و نہار کی مسافتیں جاری رہیں مگر کشمیر کا مسئلہ حل نہ ہوا...... کبھی کبھار کشمیر کا مسئلہ خبروں کا موضوع بنتا مگر پھر یہ موضوع بھی کبھی سنائی نہ دیتا۔ قیام پاکستان کے ۴۳ سال بعد بھی یہ مسئلہ جوں کا توں ہے ...... شوکت آج بھی زندہ ہے مگر وہ شوکت نہیں جو اقبال کے شاہین کی سراپا تصویر تھا بلکہ ادھیڑ عمر اور مایوس شوکت ، ایک بیٹے اور ایک بیٹی کا باپ ، جسے اس کی مایوسیوں اور ناکامیوں کے احساس

نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے ......

ابھی چند روز قبل ایک عجیب واقعہ ہوا ایسا لگا جیسے تاریخ نے اپنے آپ کو دھرایا ہو۔

شوکت حکیم سے دوا لے کر جیسے ہی گھر لوٹا اس کا جوان بیٹا مقبول دوڑا ہوا آیا اور ابا کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا۔ آج کوئی غیر معمولی بات معلوم ہوتی ہے ......

"کچھ کہنا چاہتے ہو کیا؟" ...... شوکت نے مقبول کو مخاطب کر کے کہا ......

"ہاں! ابا جی کہنا چاہتا ہوں"

کشمیر کا مسئلہ پوری شدت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا ہے ...... عالمی رائے عامہ بیدار ہو چکی ہے لوگ جانوں کے نذرانے دے رہے ہیں، کشمیر کی آزادی کا وقت قریب ہے ...... مجھے اجازت دیجئے میں حریت پسندوں کے ساتھ مل کر کچھ کرنا چاہتا ہوں" مقبول نے پھر دہرایا "میرے اچھے ابا جی مجھے اجازت دیجئے" شوکت خاموشی سے مقبول کے چہرے کو تکتا رہا ایسے جوان بیٹے کو اپنی زبان سے کیسے اجازت دے دوں کچھ ہو گیا تو ...... کئی اندیشے کئی امکان۔ اس کے وجود پر لرزہ ساطاری ہو گیا۔

"...... نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ...... اجازت نہیں ملے گی ......" پھر اچانک وہ پیچھے کی طرف چلا گیا۔ اسے وہ وقت یاد آگیا جب اس کے ابا نے اسے جہاد پر جانے سے روک دیا تھا ...... تب اسے خیال آیا کہ ٹھیک ہی تو کیا تھا ابا نے ...... اپنے خون کو اپنے جوان بیٹے کو کون دھکیل سکتا ہے موت کے دریا میں کوئی بھی نہیں کوئی بھی نہیں ......

مگر پھر اچانک اس کے سامنے رمضان چاچا کی تصویر آگئی جس کے دو جوان بیٹے آزادی کی راہ میں مارے گئے تھے ...... منشی اکرم اور ماسٹر نذیر یاد آئے جن کی اکلوتی اولادیں آزادی کشمیر کے لئے اپنی جانیں نچھاور کر چکے تھے ......

اسے ایک ایک کر کے وہ بہت سے لوگ یاد آتے رہے جو آزادی کی شمع کے لئے اپنی جانوں کے نذرانے دے چکے تھے، پھر اسے دور غلامی کے مظالم بھی یاد آنے لگے ...... جلتی ہوئی بستیاں، لٹتے ہوئے انسان، چیخیں، آہیں اور سسکیاں ...... یہ سب کچھ تو ہوتا رہے گا اس وقت تک جب تک آزادی کے متوالے اپنے لہو سے آزادی کے دیپ نہ جلالیں۔

اس خیال کے ساتھ ہی اس کی مایوس آنکھوں میں امید کی چمک سی آگئی ...... اس نے محبت بھری نظروں سے مقبول کو دیکھا ...... اسے قریب بلایا سینے سے لگایا اور کہا ...... "اللہ تمہارا نگہبان" آنکھوں سے دو آنسو اس کے گالوں پر لڑھک گئے، مگر آج وہ مطمئن تھا ...... بہت مطمئن جیسے کوئی بہت بڑا فرض ادا کر دیا ہو۔

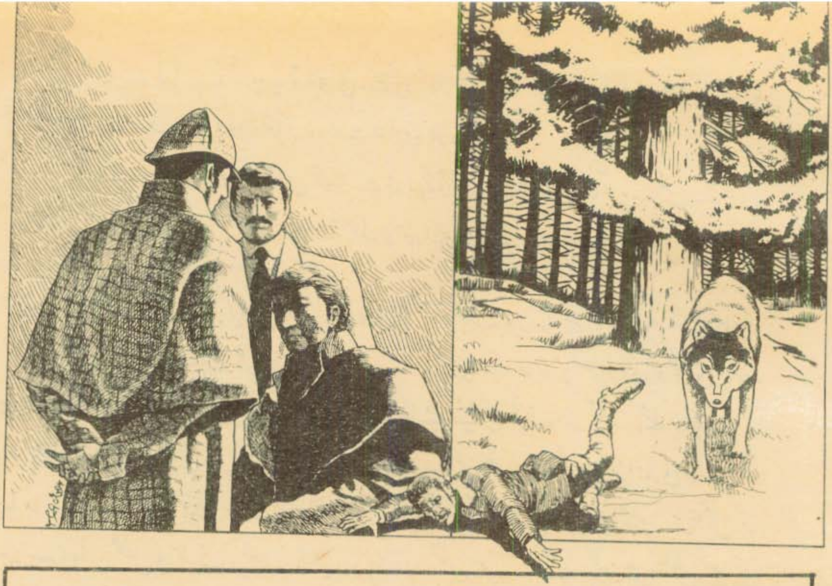

باسکروِل کا شکاری کتّا

سر آرتھر کونن ڈویل
ترجمہ۔ شاہنواز فاروقی

(دوسرا اور آخری حصّہ)

میں اپنے دوست شرلاک ہومز کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ وہ ایک دستاویز کا مطالعہ کر رہا تھا جو مور ٹائمر نامی شخص وہاں چھوڑ گیا تھا۔ یہ باسکروِل خاندان کی خاندانی دستاویز تھی جس میں بڑی جادوئی سی کہانی لکھی تھی۔ باسکرول خاندان کی افراد پر کسی وجہ سے ایک شکاری کتے کا عذاب مسلط ہو گیا تھا۔ اور اس خاندان کے کئی افراد بڑی پراسرار موت سے دو چار ہو گئے تھے۔ شام کو ٹائمر نے مزید تفصیلات بتائیں تو ہومز نے مجھے سر ہینری اور ڈاکٹر مور ٹائمر کے ساتھ اس قصبے کی طرف روانہ کر دیا جہاں یہ پر آسیب کوٹھی موجود تھی۔ سر ہینری باسکرول خاندان کے آخری فرد تھے۔ ہم لوگ بذریعہ ٹرین اس قصبے میں پہنچے۔ اور گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر باسکرول کی کوٹھی کی جانب روانہ ہوئے۔ یہ ملا جلا نیم پہاڑی علاقہ تھا۔ بنجر زمین ناہموار سی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم درختوں سے گھری ہوئی ایک کوٹھی میں جا پہنچے۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد ہم لوگ سیر کو نکلے تو ایک شکاری ملا جو تتلیاں پکڑ رہا تھا۔ جیک اسٹیپلٹن نامی یہ شخص اسی علاقے میں رہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ خطرناک دلدلی علاقہ ہے۔ پھر میرے سامنے ہی ایک جنگلی ٹٹو دلدل میں پھنسا۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمین کے اندر غائب ہو گیا پھر ایک پراسرار چیخ سنائی دی۔ جیک نے بتایا کہ یہ باسکرول کے شکاری کتے کی آواز ہے جو شکار کی تلاش میں رہتا ہے۔

شام ڈھلے میں اور سر ہینری واپس کوٹھی کی طرف جا رہے تھے۔ اندھیرے کو پھیلتے دیکھ کر سر ہینری نے کہا۔

"دستاویز میں باسکرول کے ہر زندہ شخص کو ہدایت کی گئی ہے کہ رات کو ناہموار زمین کے قریب سے نہ گزرے۔"

ابھی سر ہینری نے اپنا جملہ مکمل ہی کیا تھا کہ وہی پراسرار آواز پھر فضا میں گونجی۔

"میرے خدا ! واٹسن یہ تو شکاری کتے کی آواز تھی۔" سرہینری نے کہا۔ ان کی آواز کی لڑکھڑاہٹ سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت خوفزدہ ہو چکے ہیں۔

"جب میں لندن میں تھا تو اس آواز سے ڈرنے والوں کا مذاق اڑاتا تھا مگر اب میں نے خود یہ آواز سنی ہے تو میں خود...... " ہینری نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے سردی لگ رہی ہے۔ کیا میں خطرہ میں ہوں؟" سرہینری نے میرا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

کوئی جواب دیئے بغیر میں سرہینری کو لے کر تیزی کے ساتھ باسکرول کی کوٹھی کی جانب بڑھنے لگا۔ ابھی ہم کچھ ہی دور چلے تھے کہ میری نظر سامنے ٹیلے کی طرف اٹھ گئی۔ ٹیلے پر ایک بڑا سا پتھر پڑا ہوا تھا میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس پتھر پر ایک شخص کھڑا ہماری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے تقریباً چیختے ہوئے سرہینری کو اس شخص کی جانب متوجہ کیا لیکن اس سے قبل کہ سرہینری اس شخص کی طرف دیکھتے وہ غائب ہو چکا تھا۔ لیکن میں نے اسے دیکھنے میں غلطی نہیں کی تھی۔ وہ یقیناً پتھر پر موجود تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی باسکرول کے خانساماں بیری مور سے اس آدمی کی تصدیق ہو سکتی تھی۔

ہم باسکرول کے کوٹھی پر پہنچے تو بیری مور میرا منتظر تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایک شخص جھاڑیوں سے بھری ناہموار زمین پر چھپا ہوا ہے۔ بیری مور نے بتایا کہ وہ شخص وہیں کہیں پتھروں سے سے بنی ہوئی ایک جھونپڑی میں رہتا ہے۔

"یہ بات مجھے قصبہ کے اس لڑکے نے بتائی ہے جو ہر روز اس اجنبی کے لئے کھانا لے کر جاتا ہے۔" بیری مور سخت گھبرایا ہوا تھا۔ "یہ جگہ کیا پہلے ہی کم خطرناک تھی کہ اس پر اسرار اجنبی نے آکر اسے اور پراسرار بنا دیا ہے۔" بیری مور بڑبڑایا۔

اجنبی کے بارے میں بیری مور کی تشویش کا مطلب یہ تھا کہ ہم دونوں مشترک خطوط پر سوچ رہے تھے کیا اس اجنبی کا شکاری کتے سے کوئی تعلق تھا؟ ہم دونوں سرہینری کی حفاظت کے سلسلہ میں گہری تشویش کا شکار ہو چکے تھے۔

میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ چنانچہ اسی دوپہر کو میں کھانا کھاتے ہی اپنا پستول لے کر ناہموار زمین کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں آہستہ آہستہ پتھروں سے بنی ہوئی جھونپڑی کی جانب بڑھنے لگا۔ پھر میں پستول کو ہاتھ میں لیے اس جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ البتہ

MERYL HENDERSON

عید روزہ داروں کے لئے اللہ کا انعام ہے

عید دنیا بھر کے مسلمانوں کی یکجہتی کا دن ہے

آپ سب کو عید مبارک

منجانب

ماہنامہ آنکھ مچولی۔ کراچی

POST CARD

Name ____________________

Address ____________________

____

جھونپڑی میں کچھ کمبل، پانی کی بوتلیں۔ اور کھانے پینے کی کچھ چیزیں موجود تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے اجنبی کی پناہ گاہ پر قبضہ کر لیا ہے۔

میں اس جھونپڑی میں بیٹھ کر اجنبی کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ یہ دوپہر کا درمیانی وقت تھا۔ میں پستول کے ٹریگر پر انگلی رکھے بالکل تیار بیٹھا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ انتظار کے بعد جھونپڑی کے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں تیزی کے ساتھ اٹھ کر جھونپڑی کے تاریک کونے میں کھڑا ہوگیا۔ پستول پر میری گرفت مضبوط ہوگئی، میری انگلی کسی بھی لمحے ٹریگر کو دبانے کے لئے تیار تھی۔ اجنبی اندر نہ آیا۔ پھر اچانک ایک مانوس سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"باہر آجاؤ واٹسن۔ دیکھو شام کتنی خوبصورت ہے۔" چند لمحوں کے لئے مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ "ہومز" پھر اچانک ہی میں چلایا۔

"ہاں میں! اب باہر آجاؤ۔ مگر پستول کو جیب میں رکھ کر"۔ شرلاک ہومز نے کہا۔

ہومز کو دیکھ کر مجھے ناقابل بیان خوشی ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ہم سب کو یہ یقین دلا کر کہ وہ لندن ہی میں ہے ہمارے پیچھے چلا آیا تھا۔ اور یہاں آکر ناہموار زمین کے ٹیلوں میں چھپ گیا تھا تاکہ حالات و واقعات کا گہری نظر سے جائزہ لے سکے۔

ہومز نے مجھ سے بہت سی باتیں پوچھیں۔ مثلاً یہ کہ میں یہاں آکر کہاں ٹھہرا، کس کس سے ملا۔ اور کیا کام کیا؟ میں نے اسے اب تک کی اپنی ساری سرگرمیوں کے بارے میں بتایا۔ وہ نہایت خاموشی کے ساتھ میری باتیں سنتا رہا۔ مگر جب میں نے اسٹیپلٹن کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔

"وہ اتنا بے ضرر نہیں جتنا کہ وہ نظر آتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے حیرت سے ہومز کی جانب دیکھ کر پوچھا

"اس مسکراتے ہوئے چہرے کے پیچھے ایک قاتل چھپا ہوا ہے۔ وہ ایک گھناؤنے قتل کی سازش کر رہا ہے۔" ہومز نے کہا۔ میں ہونقوں کی طرح ہومز کو تک رہا تھا۔ ہومز نے میری جانب دیکھا اور سنجیدگی سے کہا۔

"میں ابھی تمہیں تفصیلات نہیں بتا سکتا۔ مگر اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ جس طرح اسٹیپلٹن کی نظریں سر ہینری پر جمی ہوئی ہیں اسی طرح میری نظریں اسٹیپلٹن پر جمی ہیں۔ بس خطرہ یہ ہے

کہ وہ سرہینری پر پہلے حملہ نہ کر دے۔"

"خدا نے چاہا تو یہ کیس ایک دو دن میں ہی ختم ہو جائے گا۔"

اس کے بعد ہومز نے کہا کہ اب اس کے لئے چھپ رہ کر کام کرنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ چنانچہ وہ میرے ساتھ باسکر ول میں ٹھہرنے کے لئے باسکر ول کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ سر ہینری شرلاک ہومز کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بولے

"تو جناب آپ کی تفتیش کہاں تک پہنچی۔ کیا کوئی سراغ ملا؟"

"یہ معاملہ اپنے وقت سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا۔ بشرطیکہ بہ وقت ضرورت آپ بغیر کسی حجت کے میری باتوں پر عمل کریں" ہومز نے کہا۔ سر ہنری نے ہومز سے ہر ممکن تعاون کا وعدہ کیا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

سر ہنری کے جاتے ہی ہومز اور میں کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ اس کمرے کی دیواروں پر باسکر ول خاندان کے گذشتہ تین سو برس میں پیدا ہونے والے ممتاز افراد کی تصاویر آویزاں تھیں۔ ہومز ہر تصویر کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے لیمپ ہاتھ میں لے کر ایک تصویر کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ یہ سر ہیوگو کی تصویر تھی۔ اسی سر ہیوگو کی جس سے اس منحوس اور پر اسرار قصہ کا آغاز ہوا تھا۔ "ذرا اس کو دیکھو واٹسن!" ہومز نے مجھ سے کہا۔

"میں نے تصویر کے قریب جا کر اسے غور سے دیکھا۔ اسکے پتلے پتلے ہونٹ آپس میں سختی سے جُڑے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں سرد مہری بھری ہوئی تھی۔ اور چہرہ سخت تاثرات کی عکاسی کر رہا تھا۔ "اچھا اسے پھر دیکھو" ہومز نے مجھے پھر کہا۔

اب ہومز نے اپنے ایک ہاتھ کے ذریعہ تصویر کا ہیٹ اور لٹکتے ہوئے بالوں کو اس طرح چھپا لیا تھا کہ اب اس تصویر کا صرف چہرہ نظر آ رہا تھا۔

میں نے تصویر کو دوبارہ دیکھا تو حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سر ہیوگو اور اسٹیپلٹن کے چہرے میں حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی تھی۔ ناقابل یقین سی بات تھی۔

یہ تو اسٹیپلٹن سے ملتا ہے۔" میں نے ہومز کی طرف دیکھ کر تعجب سے کہا۔ ہومز نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور بولا۔

"ہاں اسٹیپلٹن کا تعلق یقینی طور پر باسکر ول خاندان کے ساتھ ہے اب ہم اندازہ کر سکتے

ہیں کہ وہ سر ہیوگو کا دشمن کیوں ہے۔ فکر نہ کرو آئندہ رات کو میں اسے اپنے جال میں پھانس لو نگا۔ مگر تم اس سلسلہ میں سر ہنیری کو ایک لفظ بھی نہیں کہو گے۔"

ہومز اگلی صبح جلد ہی بیدار ہو گیا وہ بہت پر جوش نظر آتا تھا۔ اسٹیپلٹن نے اس روز سر ھینری کو ملاقات کے لئے بلایا تھا۔ سر ہینری نے مجھے اور ہومز کو اپنے ہمراہ چلنے کو کہا۔ مگر ہومز نے کہا۔ "معاف کیجئے! آج مجھے اور واٹسن کو ایک نہایت ضروری کام کے سلسلہ میں لندن جانا ہے۔ اس لئے ہم آپ کے ہمراہ نہ جاسکیں گے۔"

اگرچہ ہومز کی یہ بات میرے لئے ایک خبر تھی مگر میں خاموش رہا۔ سر ہینری کو ہومز کے اس جواب سے بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ بولے۔

"پھر میں بھی آپ کے ساتھ ہی لندن چلتا ہوں"

نہیں آپ کو یہیں ٹھہرنا ہو گا" ہومز نے کہا۔

"یاد رکھئے آپ مجھ سے میری ہر بات کی تعمیل کا وعدہ کر چکے ہیں۔ آپ پروگرام کے مطابق اپنے دوست اسٹیپلٹن سے ملنے جائیے۔ واپسی میں آپ ناہموار زمین والے راستہ سے گھر آئیے گا۔ اور ہاں اس بارے میں اسٹیپلٹن کو ضرور بتا دیجئے گا۔"

"مگر آپ نے تو مجھے خود اس راستے سے آنے کے لئے منع کیا تھا" سر ہینری نے جواب دیا۔

"آپ میری بات کا اعتبار کیجئے۔" ہومز نے اس بات پر زور دے کر کہا۔

"اس بار آپ بے شک محتاط رہئے گا۔ مگر آپ کو آنا اسی راستے سے ہو گا۔ میرا مطلب ہے ہر قیمت پر۔"

مجھے سر ھینری کی طرح ہومز کی اس ہدایت پر حیرت ہو رہی تھی مگر میں خاموش رہا۔

چند گھنٹوں بعد ہومز اور میں باسکرول کی کوٹھی سے ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔

اسٹیشن پہنچ کر ہومز نے گھوڑا گاڑی کے کوچوان کو واپس بھیج دیا۔ کوچوان نظروں سے اوجھل ہوا تو ہومز نے مجھ سے کہا کہ ہم کہیں نہیں جا رہے۔ ہومز کا پلان یہ تھا کہ اسٹیپلٹن کو اس بات کا اچھی طرح سے یقین ہو جانا چاہئے کہ ہم دونوں لندن جا چکے ہیں تاکہ وہ سر ہینری پر حملہ کرتے ہوئے خود کو محفوظ سمجھ سکے۔ ہومز کا لندن پلان سن کر مجھے حیرت نہیں ہوئی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ہومز اپنا پورا پلان مجھ سمیت کسی کو نہیں بتاتا۔

ہم نے اسٹیشن کی کینٹین میں کھانا کھایا اور دیر تک اسٹیپلٹن کے بارے میں باتیں کرتے

رہے۔ اسی دوران ہومز نے مجھے بہت سی تصاویر، مختلف گواہوں کے بیانات کی کاپیاں اور کئی دوسری دستاویزات دکھائیں۔ ان سب سے ثابت ہوتا تھا کہ اسٹیپلٹن گزشتہ برسوں میں انگلینڈ کے مختلف حصوں میں مختلف نام بدل کر رہتا رہا ہے۔

کھانے کے بعد ہومز نے ایک گھوڑا گاڑی کی اور گھوڑا گاڑی کے کوچوان کو ایک سمت میں چلنے کو کہا۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ اور ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ہماری گھوڑا گاڑی تاریکی کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ گھوڑا گاڑی کے کوچوان کی موجودگی میں ہم کھل کر بات نہیں کر پا رہے تھے۔ جب ہماری گھوڑا گاڑی جھاڑیوں سے بھرے ہوئے ناہموار علاقہ کی طرف مڑی تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

کوچوان نے ہمیں باسکرول کی کوٹھی کے قریب اتار دیا اور ہم دونوں اسٹیپلٹن کے گھر کی جانب چل پڑے۔ پورے قصبے پر گہری دھند چھائی شروع ہو چکی تھی۔ ہومز اسٹیپلٹن کے گھر سے دو سو میٹر کے فاصلہ پر رک گیا۔

"یہ جگہ ٹھیک ہے یہاں ہم ان پتھروں کے پیچھے آسانی کے ساتھ چھپ سکتے ہیں"

ہومز اور میں پتھروں کے پیچھے چھپ گئے۔ اگرچہ ہمیں اسٹیپلٹن کا گھر نظر آرہا تھا مگر گھر کے اندر کیا ہو رہا تھا اس سے ہم بے خبر تھے۔

کچھ دیر بعد ہومز نے مجھ سے کہا کہ میں گھر کے قریب جا کر یہ پتہ چلانے کی کوشش کروں کے سر ہینری اور اسٹیپلٹن کیا کر رہے ہیں۔ میں اسٹیپلٹن کے گھر کے باغیچہ کی پستہ قد دیوار سے باغیچہ میں کود گیا۔ کچھ آگے چل کر مجھے ایک ایسی بے پردہ کھڑکی میسر آگئی جس سے میں سر ہینری اور اسٹیپلٹن کو دیکھ سکتا تھا۔ اس وقت وہ دونوں رات کے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ اس وقت اسٹیپلٹن گفتگو کر رہا تھا۔ سر ہینری کا چہرہ زردی مائل لگ رہا تھا۔ شاید انہیں خطرناک راستہ سے گھر واپس جانے کا خیال آرہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اسٹیپلٹن اٹھ کر گھر سے باہر آیا اور قریب ہی واقع ایک دوسرے مکان میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اس گھر سے کچھ جھگڑنے کی سی آوازیں آئیں۔ چند لمحوں بعد اسٹیپلٹن اس گھر سے باہر آیا اور اسے تالا لگا کر سر ہینری کے پاس واپس چلا گیا۔ میں دبے قدموں ہومز کے پاس واپس آیا اور اسے وہ سب کچھ بتایا جو میں نے دیکھا اور سنا تھا۔

اس وقت تک دھند مزید گہری ہونے لگی تھی۔ ہومز نے یہ دیکھا تو تشویش کے ساتھ بولا۔

"یہ تشویش ناک بات ہے۔ اس سے قبل کے دھند اور گہری ہو سر ہینری کو گھر کے لئے چل دینا چاہئے۔ ان کی زندگی کا دار و مدار اسی پر ہے۔ مزید دیر نہیں ہونی چاہئے۔ پہلے ہی رات کے دس بج چکے ہیں۔"

ہم پتھروں کے پیچھے چھپے سر ہینری کے باہر آنے کا انتظار کرتے رہے، دھند اور گہری ہوتی جارہی تھی۔

"میرا خیال ہے اب ہم سر ہینری کو دیکھ بھی نہیں پائیں گے" ہومز نے گہری ہوتی ہوئی دھند کو دیکھ کر کہا۔

"ہمیں بلند مقام پر چلنا چاہئے تاکہ ہم سر ہینری کو دیکھ سکیں" میں نے تجویز پیش کی۔

اچانک ہومز زمین سے کان لگا کر کچھ سننے لگا۔

"یقیناً جوتوں کی آوازیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سر ہینری آرہے ہیں" ہومز نے کہا۔

چند لمحوں بعد سر ہینری کے قدموں کی آوازیں مجھے بھی سنائی دینے لگیں۔ ہم تیزی سے پتھروں کے پیچھے چھپ گئے؟ چند لمحوں بعد سر ہینری دھند سے بر آمد ہوئے اور پھر چلتے ہوئے ہمارے پاس سے گزر گئے۔ وہ چند لمحوں بعد خوف زدہ چہرے کے ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھتے جارہے تھے۔ "واٹسن وہ آرہا ہے" یکایک ہومز چلّایا۔

میں نے دیکھا کہ ہم سے کوئی پچاس قدم آگے ایک خوفناک ہیئت کی چیز دھند سے بر آمد ہوئی۔ میں اچھل پڑا۔ یہ ایک خوفناک چہرے اور بڑے قدو قامت کا سیاہ رنگ کا شکاری کتّا تھا۔ ایک عجیب سی روشنی اسکے منہ سے نکل کر اسکے جبڑوں اور آنکھوں کو نمایاں کررہی تھی۔ میں نے ایسا خوفناک کتّا اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کتا تیز قدموں سے اس راستے کو سونگھتا ہوا چل رہا تھا جس پر سر ہینری ابھی کچھ دیر پہلے گئے تھے۔ اس سے قبل کہ ہم دونوں کے اوسان بحال ہوتے کتا ہمارے آگے سے گزر چکا تھا۔ پھر اچانک ہی ہومز اور میرے پستولوں سے بیک وقت شعلے نکل کر کتے کی طرف لپکے۔ کتے کے منہ سے زور دار چیخ بر آمد ہوئی مگر وہ رکا نہیں۔

سر ہینری رک کر خوف کے عالم میں اس کتے کو دیکھ رہے تھے جو لمحہ بہ لمحہ ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

کتے کے منہ سے نکلنے والی کراہ سے ہمیں اتنا تو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ایک کتا ہی ہے کوئی بھوت پریت نہیں۔ ہومز کتے کے پیچھے بھاگا۔ اچانک ہی فضا میں سر ہینری کی چیخیں بلند ہوئیں۔ کتے نے حملہ کر کے انہیں زمین پر گرا دیا تھا اور اب ان کا گلا دبانا چاہتا تھا۔ ہومز نے اپنے پستول کی پانچوں

گولیاں کتے کے جسم میں اتار دیں۔ کتے نے تکلیف کے عالم میں اپنے اگلے پاؤں فضامیں اٹھائے اور پھر بے دم ہوکر زمین پر گر گیا۔ میں نے کتے کے اوپر جھک کر دیکھا وہ مر چکا تھا۔

سر ہینری بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ میں انہیں ہلا کر ہوش میں لایا۔ ہوش میں آتے ہی وہ بڑبڑائے "میرے خدا یہ کیا بلا تھی؟"

"یہ جو کچھ بھی تھی اب مرچکی ہے" ہومز نے کہا۔

"آپ کو خاندانی بھوت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی ہے" میں نے کہا۔

یہ ایک بڑے قدو قامت کا کتا تھا اس لئے اس پر کتے سے زیادہ شیر کے بچے کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے سر اور جبڑوں سے ابھی تک ہلکی نیلی روشنی خارج ہورہی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر اٹھایا تو میری انگلیوں سے بھی اندھیرے میں ہلکی نیلی روشنی خارج ہونے لگی۔

"فاسفورس" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہاں فاسفورس کا ذہانت آمیز استعمال" ہومز نے کہا

ہمیں معلوم تھا کہ ہمارے پستولوں سے نکلنے والی گولیوں کی آواز سن کر اسٹیپلٹن کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اس کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ ہم تینوں نے اسٹیپلٹن کے گھر پہنچ کر اسے گھر کے ایک ایک کونے میں تلاش کیا مگر وہ فرار ہو چکا تھا۔ اگر چہ ہومز کو اس جگہ سے باہر جانے والے واحد راستے کے بارے میں معلوم تھا مگر چونکہ اب دھند بے حد گہری ہو چکی تھی اس لئے اسٹیپلٹن کا تعاقب بے کار تھا، اس لئے ہم تینوں باسکرولی کی کوٹھی میں پلٹ آئے۔ راستے میں شرلاک ہومز نے سر ہینری کو بتایا کہ اسٹیپلٹن نے انہیں کس طرح ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

شکاری کتے کی ہلاکت کے بعد اگلی صبح جب دھند ختم ہوچکی تو ڈاکٹر مور ٹائمر ہمیں لے کر اس راستے پر جا نکلے جس کا تذکرہ ہم نے اوپر کیا ہے۔ ہر طرف جنگل کی ایک مخصوص خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ راستہ کیچڑ آلود تھا اور ہم تینوں کے پاؤں بار بار اس میں اندر تک دھنس رہے تھے۔

راستے پر قدموں کے نشانات موجود تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہمارے آنے سے قبل کوئی اس راستے سے ہوکر گزرا ہے۔ تھوڑا آگے چل کر ہمیں اسٹیپلٹن کا ہیٹ پڑا ہوا ملا جو شاید کل رات بھاگتے وقت اس کے سر سے گر گیا تھا۔ یہ ہیٹ اسٹیپلٹن کی آخری نشانی تھا۔ اس کے بعد اسٹیپلٹن کبھی نظر نہ آیا۔ شاید وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس علاقے میں موجود دلدل میں اتر چکا تھا۔

اس جھونپڑی سے جس میں اسٹیپلٹن نے اس شکاری کتے کو رکھا ہوا تھا ہمیں ایک مضبوط چین، کچھ ہڈیاں اور ایک ایسا کنستر ہاتھ لگا جس میں اسٹیپلٹن فاسفورس گھول کر کتے کے سر اور جبڑوں پر لگاتا تھا تاکہ وہ بھوت پریت جیسی کوئی چیز نظر آسکے۔ شاید کتے کی ایسی خوفناک صورت سے ڈر کر سر چارلس کی موت واقع ہوئی تھی۔

اسٹیپلٹن نے اس خوفناک کتے کو صرف دو مواقع پر اپنے گھر رکھا تھا۔ ایک سر چارلس پر حملہ کے وقت اور دوسرے سر ہینری پر حملے کے وقت۔ ان دو مواقع کے سوا کتا ہمیشہ اپنے مخصوص کیبن میں بند رہتا تھا۔ مگر اسٹیپلٹن اس کتے کی آوازوں کو بند نہیں کرسکا تھا۔

اس کہانی کے کئی معاملات جو میری سمجھ سے باہر تھے کچھ دنوں کے بعد لندن لوٹتے ہوئے ہومز نے مجھے ان کے بارے میں وضاحت سے بتاتے ہوئے کہا

"اسٹیپلٹن کا تعلق باسکرول خاندان سے ہی تھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس کے بارے میں ہم نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ ابتداء میں ہمیں ڈاکٹر مور ٹائمر نے بھی یہی بتایا تھا کہ سر ہینری باسکرول خاندان کا آخری فرد تھا۔

مگر ایسا نہیں تھا۔ سر چارلس کے بھائی روجر کا کہانی میں موجود بیان کے برعکس برازیل میں گردن توڑ بخار سے انتقال نہیں ہوا تھا۔ بلکہ درحقیقت اس نے شادی کرلی تھی اور اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔ اس کے بیٹے کا نام بھی روجر ہی تھا۔ یہی لڑکا بعد میں اسٹیپلٹن کے نام سے جانا گیا۔

جب اسٹیپلٹن انگلینڈ آیا تو اسے معلوم ہوا کہ باسکرول خاندان کی دولت پر قبضہ کے لئے اسے ایک یا دو افراد کو ہلاک کرنا ہوگا۔

ابتداء میں اس کا پلان غیر واضح تھا۔ اس نے یہاں آنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ باسکرول کے کوٹھی کے نزدیک ہی رہائش اختیار کی۔ دوسرا کام اس نے یہ کیا کہ سر چارلس سے دوستی کرلی۔

جب سر چارلس نے اسے باسکرول خاندان پر نازل ہونے والے عذاب کے بارے میں بتایا تو اسٹیپلٹن نے اس کہانی کو حقیقت کا روپ دینے کا منصوبہ بنایا۔ اپنے ایک اور دوست ڈاکٹر مور ٹائمر سے اسے معلوم ہوا کہ سر چالس دل کے مریض ہیں اور وہ کسی بھی معمولی صدمے کے نتیجہ میں ہارٹ اٹیک کا شکار ہوکر مرسکتے ہیں۔ اسٹیپلٹن نے لندن سے عظیم الجثہ کتا خریدا تھا۔

یہ بات کسی کے علم میں نہیں کہ اسٹیپلٹن نے کتے کے ساتھ کتنی بار رات کی تاریکی میں

اپنے شکار کا انتظار کیا تھا اور اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پھر ایک رات جب سر چارلس باسکرول کی کوٹھی کے راستے پر ٹہل رہے تھے تو اسٹیپلٹن نے ان پر اپنا خوفناک کتا چھوڑ دیا۔ سر چارلس دہشت زدہ ہو کر بھاگے اور اسی دہشت کے عالم میں ان کی موت واقع ہو گئی۔"

اس کے بعد ہومز جب ناہموار راستے کی جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا اس سے میری ملاقات ہو گئی۔ اس وقت تک ہومز اسٹیپلٹن کے بارے میں تمام باتیں جان کر اپنے منصوبے بنا چکا تھا۔ ہومز کو معلوم تھا کہ اسٹیپلٹن کو مجرم ثابت کرنے کے لئے لازم ہے کہ اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ہومز نے سر ہینری کو شکار کے طور پر استعمال کیا۔ تاکہ اسٹیپلٹن جرم کرتا ہوا پکڑا جاسکے۔

تاہم اس کہانی کی ایک بات آج بھی میری سمجھ سے باہر ہے اور وہ یہ کہ اگر سر ہینری ہلاک ہو جاتے تو اسٹیپلٹن باسکرول کے خاندان کی دولت پر کس طرح قبضہ کرتا۔ آخر وہ اس ضلع میں پچھلے دو برسوں سے ایک فرضی نام رکھ کر رہ رہا تھا۔ اور دنیا اسے اسکے اسی فرضی نام کے حوالے سے جانتی تھی۔

ہومز کے پاس بھی اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ بس خیال کیا جاسکتا ہے کہ اسٹیپلٹن اپنے شکار کو ہلاک کرنے کے بعد خاموشی سے واپس برازیل چلا جاتا اور وہاں سے اپنے اصلی نام یعنی روجر باسکرول کے حوالے سے باسکرول خاندان کی دولت کی وراثت کا دعویدار بنتا۔ لیکن ایسا کرنے کے لئے اسے انگلینڈ آنے کی ہرگز ضرورت نہ ہوتی۔

صرف ایک بات طے ہے۔ کہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے یہ ظالم اور شیطان صفت انسان کسی نہ کسی راستے کو ضرور تلاش کر لیتا۔

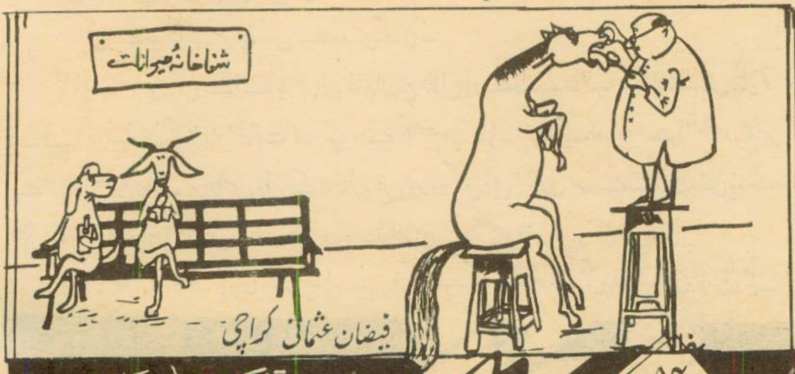

کھٹّے میٹھے

ماہِ رواں کے منتخب لطائف

انعامی لطیفہ

استاد (شاگرد سے) "جب میں تمہارے جتنا تھا تو ہر سبق فرفر سناتا اور ہر سوال کا جواب فوراً دیا کرتا تھا۔"
شاگرد (معصومیت سے)۔ "آپ کو کوئی قابل استاد مل گیا ہو گا۔"

نگار بصیرپوری

ایک آدمی میڈیکل اسٹور میں داخل ہوا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس پر بری طرح کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ میڈیکل اسٹور کے سیلز مین نے اسے فوراً پانی پلایا۔ اور پھر بولا۔
"فرمایئے آپ کیا کہنا چاہتے تھے؟"۔
"یہی کے رقم نکال کر اس بیگ میں ڈال دو۔"
اس شخص نے بیگ سے ریوالور نکالا اور بیگ کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

محمد عقیل نواب وحید صدیقی...... لسبیلہ کراچی

غفران۔ "آج ہماری بھینس کھو گئی ہے۔ سارا گھر پریشان ہے"
حامد۔ "تو اخبار میں اشتہار دے دو"
غفران۔ "یہی تو مشکل ہے ہماری بھینس ان پڑھ ہے۔" (نامعلوم)

روس میں ایک شخص کو وزیر تعلیم کو احمق کہنے پر بیس برس قید کی سزا دی گئی ان میں سے پانچ برس کی سزا حکومت سے وابستہ ایک شخص کی توہین

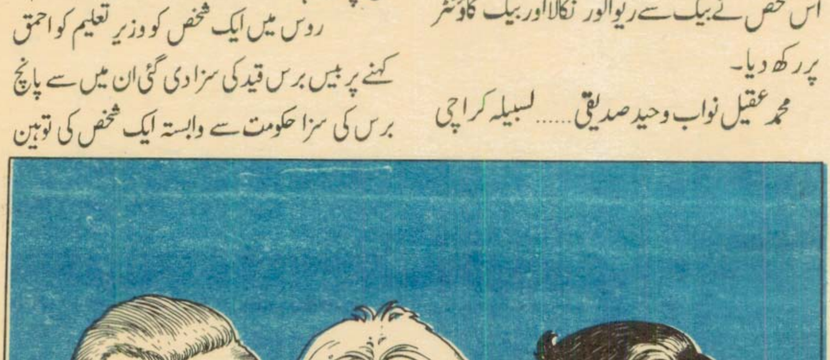

کرنے پر تھی جب کہ پندرہ برس سرکاری راز فاش کرنے پر۔ حنا بشیر دھوراجی کالونی کراچی

بیگم صاحبہ کو باورچی کی ضرورت تھی۔ ایک شخص آیا اور اپنی خدمات پیش کیں۔ بیگم صاحبہ نے پوچھا کیا تم کھانا پکانا جانتے ہو
باورچی نے کہا۔ جی ہاں دو طرح کے۔
بیگم نے حیران ہو کر پوچھا۔ کیا مطلب۔
باورچی نے کہا۔
"ایسے کھانے کہ مہمان کھائیں تو دوسری بار آنے کی خواہش رکھیں اور ایسے بھی کہ کبھی بھول کر بھی آپ کے گھر کا رخ نہ کریں۔"

.... ○ ....

ایک لڑکا۔ پڑھنا لکھنا کس نے ایجاد کیا تھا؟

دوسرا لڑکا۔ کسی جاہل نے ہی کیا ہوگا۔
محمد سعید گلاب کورنگی نمبر ا کراچی نمبر ۳۱
ایک آدمی گرمی کے موسم میں کوٹ پہنے ہوئے اپنے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ کہ ایک دوسرے آدمی کا ادھر سے گزر ہوا۔
اس آدمی نے جب پہلے آدمی کو دیکھا۔ تو حیرت زدہ ہو کر بولا "یار تم نے گرمی کے موسم میں کوٹ کیوں پہنا ہے۔ تو پہلے آدمی نے کہا۔ "یار ہمیں شاپنگ کے لئے جانا ہے۔ جب تک میری بیوی تیار ہو گی تو یقیناً سردیاں آچکی ہونگیں۔"

خیرم محمد خان کوہاٹی

ایک بہت ہی کنجوس شخص نے ایک ٹوپی پندرہ سال تک پہنی کہ پھر آخر کار دل پر پتھر رکھ کر نئی ٹوپی خریدنے کا ارادہ کیا اور اپنے پڑوسی دکاندار کے پاس گیا اور اطمینان کے ساتھ چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ "آج پھر مجھے ایک ٹوپی دیجئے۔" ضیاء الدین...... کراچی

ایک اسکول انسپکٹر معائنے کے لئے ایک اسکول میں گیا۔ ایک جماعت سے آواز آرہی تھی کہ۔ "دریائے سندھ جہلم سے نکلتا ہے۔" انسپکٹر صاحب فوراً کلاس میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ آواز استاد صاحب کی تھی۔
بولا کہ "آپ بچّوں کو غلط پڑھا رہے ہیں دریائے سندھ......"
استاد صاحب نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "دریائے سندھ اس وقت تک جہلم سے نکلتا رہے گا۔ جب تک میری پچھلے چھ ماہ کی تنخواہ نہیں ملے گی۔" طاہر نقاش...... جلالپور شریف

جارج پنجم شاہ برطانیہ کی وفات پر آل انڈیا ریڈیو سے تعزیتی پروگرام نشر ہو رہا تھا کہ اچانک کسی کی ذرا سی غلطی سے اصل اسٹوڈیو جس سے تعزیتی پروگرام ہو رہا تھا کا سلسلہ کٹ کر موسیقی کے اسٹوڈیو سے منسلک ہو گیا جہاں سازندے بیٹھے ایک دوسرے سے گپ شپ میں مصروف تھے۔ جس وقت یہ سلسلہ کٹا اس وقت اناؤنسر ایک تعزیتی مضمون پڑھ رہا تھا۔ "اعلیٰ حضرت جارج پنجم کی زبان پر مرتے وقت یہ الفاظ تھے۔ "اوئے ! میرے طبلے کی ہتھوڑی کہاں ہے۔ کم بختو ؟" کوئی طبلہ نواز چیخ کر کہہ رہا تھا۔

زاہدہ عنایت اللہ...... کراچی

جج نے کہا۔ "مجھے بتایا گیا ہے کہ تمہیں اسی کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے سڑک کی غلط سمت میں ٹھیک آدھی رات کے وقت بغیر بتیوں کی کار دوڑاتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔

ملزم:۔ "درست ہے جناب مگر میں نے جو کچھ کیا انتہائی مجبوری کی حالت میں کیا۔"

جج نے پوچھا:۔ "حالت مجبوری سے تمہاری کیا مراد ہے ؟"

ملزم نے کہا:۔ "جی میں کار چوری کر کے لے جا رہا تھا۔"

شمیم ناز عرف (بے بی)
فقیر کالونی کراچی

ایک شوہر اپنی بیوی کو تیز کار چلانے سے روک رہا تھا اس کی بیوی نہ رکی تو اس نے کہا۔ "اگر تم کار تیز چلاؤ گی تو حادثہ ضرور ہو گا حادثے کے بعد اخبار میں خبر بھی چھپے گی اور پھر اخبار والے تمہاری عمر بھی ٹھیک چھاپ دیں گے۔"

بیوی نے شوہر کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا اور کار کی رفتار آہستہ کر دی۔

نواز مظہر...... لاہور

ایک خاتون کو اپنے بھائی کا تار ملا۔ "تمہارا شوہر جو میرے ساتھ شکار پر افریقہ گیا تھا شیر کے شکار میں کام آگیا ہے۔" خاتون نے فوراً تار دیا۔ "اس کی لاش گھر بھیج

دو۔ "تین ہفتے بعد افریقہ سے ایک بڑا بکس پہنچا جس کے اندر شیر کی لاش بند تھی۔ خاتون نے پھر تار بھیجا کہ "تم سے غلطی ہوئی۔ میرے شوہر کی لاش بھیجو" جواب آیا۔ "غلطی نہیں ہوئی۔ تمہارا شوہر شیر کے اندر ہے۔"

غلام حسین میمن...... حیدر آباد

"اگر میں یہ کہوں کہ میں خوبصورت تھی تو یہ ہو گا فعل ماضی" استانی نے بچوں کو پڑھاتے ہوئے کہا۔

"اور اگر میں یہ کہوں کہ میں خوبصورت ہوں تو یہ ہو کیا ہو گا؟"

"سفید جھوٹ" کونے سے آواز آئی

اسما عظمیٰ...... حیدر آباد

دیکھیں ہماری باری کب آتی ہے

پاکستان، ویسٹ انڈیز اور بھارت کی کرکٹ ٹیموں کے منیجر اپنے فاسٹ بالروں کی بولنگ کا تذکرہ کر رہے تھے۔

ویسٹ انڈیز کے منیجر نے کہا۔ "ہمارے فاسٹ بالر کی گیند جب اس کے ہاتھ سے نکلتی ہے تو اس وقت گیند کی رفتار ۱۲۰ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔"

پاکستان کے منیجر نے کہا۔ "ہمارے فاسٹ بولروں کی گیند جب پچ پر ٹپا کھانے کے بعد اٹھتی ہے تو اس وقت گیند کی رفتار ۱۱۵ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔"

بھارت کے منیجر نے کہا۔ "ہمارے فاسٹ باولر کی گیند کی رفتار ایک موقع پر ۱۴۰ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔"

ویسٹ انڈیز کے منیجر نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کیا بالر کے ہاتھ سے نکلتے ہوئے گیند کی رفتار اتنی ہوتی ہے؟" "نہیں" بھارت کے منیجر نے کہا۔

پاکستان کے منیجر نے تعجب سے پوچھا کہ۔ "کیا گیند جب پچ پر ڈپہ کھانے کے بعد اٹھتی تو اس کی رفتار اتنی زیادہ ہوتی ہے۔"

"نہیں" بھارت کے منیجر نے ایک بار پھر کہا۔

پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے منیجروں نے بیک وقت حیران ہو کر پوچھا۔ "تو گیند کی اتنی زیادہ رفتار کس وقت ہوتی ہے؟"

"جب ہمارے فاسٹ بولر کی گیند بیٹسمین کے بیٹ سے ٹکرانے کے بعد پلٹتی ہے۔" بھارت کے منیجر نے اطمینان سے جواب دیا۔

مرتضیٰ خان...... کراچی

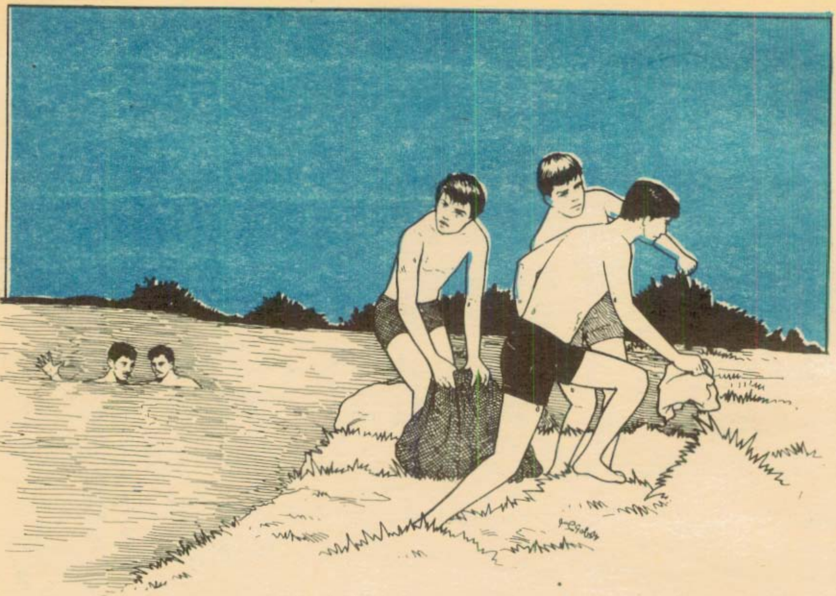

ٹھگوں کو ٹھگ لیا دادا نے میرے

محمد تنویر شعیب

"یہ ان دنوں کا واقعہ ہے کہ جب ہندوستان اور پاکستان آپس میں ملے ہوئے تھے"۔ دادا جان نے چشمے کو ناک کی پھننگ پر جمایا اور تینوں بچّوں پر ایک نظر ڈالی۔

عالی، شاکر اور مانی تینوں اس وقت دادا جان کے کمرے میں بیٹھے قصّہ سن رہے تھے، ان تینوں ہی کی فرمائش پر دادا جان نے قصّہ سنانے کی حامی بھری تھی۔

"ہاں بھئی سب سے پہلے تو میں اس کہانی سے حاصل ہونے والا سبق بتاتا ہوں، وہ یہ کہ انسان کو مشکل حالات میں بھی اپنے اوپر قابو رکھنا چاہئے اور گھبرانا نہیں چاہئے"۔ دادا جان نے پان دانتوں کے

نیچے دبایا اور پھر بولے، "یہ بات میں نے تم لوگوں کو شروع میں اس لئے بتا دی ہے کہ یہ سبق تمہارے ذہنوں میں اچھی طرح بیٹھ جائے، .... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ .... کیا کہہ رہا تھا میں؟" دادا جان نے ذہن پر زور دیا۔

"دادا جان آپ کہہ رہے تھے کہ جب ہندوستان اور پاکستان ملے ہوئے تھے" مانی نے گویا یاد دلایا۔ "ہاں یاد آیا .... ہندوستان میں "بنارس" ایک جگہ کا نام ہے، ان دنوں بنارس کے ٹھگ پورے ہندوستان میں مشہور تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر جنگلوں میں رہتے تھے اور جنگل سے گزرنے والے لوگوں کو لوٹتے تھے، یا سادہ لوح دیہاتیوں کو اپنی چالاکی سے باتوں میں لگا کر ان کا مال لے لیا کرتے تھے"۔

دادا جان نے پان کی پیک اُگال دان میں ڈالی اور پھر کہا "اس زمانے میں اسکول وغیرہ تو ہوا نہیں کرتے تھے، بس مدرسے ہوا کرتے تھے .... جہاں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دوسری تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ میں، حامد اور بشیر تینوں دوست تھے۔ گرمیوں میں مدرسے کی چھٹیاں ہوا کرتی تھیں۔ چھٹیوں کے دوران ہم نے سیر کا پروگرام بنایا۔ ہم بنارس کے علاقے میں ہی رہا کرتے تھے۔ ایک دن ہم تینوں اپنے علاقے سے کافی دور نکل آئے۔ یہ ویران علاقہ تھا لیکن ہم یہاں صرف اس ندی کی وجہ سے آئے تھے جو یہاں بہتی تھی، پھر ہم وہاں نہانے میں لگ گئے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دو آدمی وہاں آگئے .... وہ رنگین دھوتی اور اوپر سے کالی قمیص پہنے ہوئے تھے۔ سر پر دونوں کے کالی پگڑی تھی۔ ان کی بڑی بڑی مونچھوں سے ہمیں کافی خوف لگ رہا تھا۔ ہم ندی سے نکل کر ان کے پاس پہنچے۔ ہمارے پاس تھوڑی سی نقدی تھی اس کے علاوہ میرے پاس ایک قیمتی گھڑی بھی تھی جو میں نے نہاتے وقت ندی کے کنارے ایک پتھر کی اوٹ میں رکھ دی تھی میں نے جلدی سے جا کر اپنی گھڑی اٹھالی۔ پھر وہ دونوں اشخاص ہمارے قریب آئے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ ہمیں معلوم ہو گیا کہ یہ دونوں حضرات ٹھگ ہیں اور اگر ہم نے ان کو رقم آسانی سے نہ دی تو یہ ہمارے ساتھ زبردستی کریں گے۔ لہٰذا میرے ذہن نے جلدی جلدی کام کرنا شروع کر دیا .... اور آخر مجھے ایک ترکیب آہی گئی۔ لیکن میں وقت کا انتظار کرنے لگا۔ پھر اچانک وہ ہمارے پیسوں وغیرہ کے بارے پوچھنے لگے تو میں نے کہا "دیکھیں! اگر ہم مقابلہ کر لیں تو زیادہ بہتر رہے گا"

کیسا مقابلہ؟" ایک شخص نے چونک کر کہا۔

"وہ اس طرح کہ ہم سب کے درمیان ایک مقابلہ ہوتا ہے کہ کون پہلے تیر کر ندی پار کرے۔ اگر آپ لوگ جیت گئے تو ہمارے پاس جتنے بھی پیسے ہیں وہ آپ کے ہو جائیں گے ورنہ دوسری صورت میں آپ کی تمام رقم ہمارے حوالے ہو گی"۔

وہ دونوں ٹھگ تو پہلے ہی جیسے اس بات کے منتظر تھے انہوں نے فوراً ہامی بھر لی اِدھر میں نے

اشاروں ہی اشاروں میں اپنے دوستوں کو سمجھا دیا۔ پھر ہم مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ میں نے ایک، دو، تین کہا اور سب نے مل کر ندی میں چھلانگیں لگا دیں۔ ندی کی چوڑائی کافی تھی۔ ہم نے اپنے منصوبے پر عمل کیا وہ دونوں ٹھگ ہم سے کافی آگے تیر رہے تھے۔ ان پر بس یہ دھن سوار تھی کہ کسی نہ کسی طرح دوسرے کنارے پہنچ جائیں۔ ادھر جب ٹھگ ہم سے کافی آگے نکل گئے تو ہم نے واپس اس کنارے کی طرف تیرنا شروع کر دیا، جہاں سے مقابلہ شروع ہوا تھا، جلدی جلدی تیر کر دوسرے کنارے پہنچے اور اپنی نقدی اور گھڑی اٹھا کر ان دونوں کی طرف دیکھا، جو اب تیر کر دوسرے کنارے پہنچ چکے تھے۔ جب انہوں نے ہمیں دیکھا تو دوبارہ ندی میں چھلانگ لگا دی تاکہ ہمیں پکڑ سکیں لیکن اس وقت تک ہم ان کی پہنچ سے بہت دور نکل چکے تھے۔

دادا جان نے کہانی ختم کی لیکن تمام بچّے کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے پھر عالی بولا "کیا دادا جان واقعی یہ سب کچھ سچ ہے ....؟

"اور نہیں تو کیا ہم جھوٹ بول رہے ہیں" دادا جان نے غصّے سے کہا اور وہ تینوں ہنستے ہوئے باہر بھاگ گئے۔

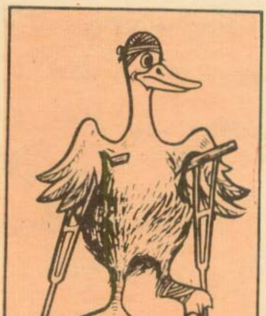

پرندوں کو نہ ماریئے

پرندے ہماری کائنات کا حُسن ہیں

پرندے نظامِ حیات کا جزوِ لازم ہیں

اِنھیں نہ ماریئے ——————

انھیں ان کی فطری عمر تک جینے کا حق دیجیے

فطرت کے کرشمے

شین فاروقی

آپ نے انسانوں، حیوانوں اور پودوں کے اندر پائی جانے والی حیرت انگیز قوتوں کے بارے میں پڑھا ہوگا۔ اسی طرح آپ نے زمین کے اندر پائی جانے والی قوتوں اور سورج چاند ستاروں کے اُن اثرات کے بارے میں پڑھا ہوگا جو وہ زمین پر رہنے والے انسانوں اور اُن کے ماحول پر مرتب کرتے ہیں۔ آج ہم آپ کو فطرت یا قدرت یعنی NATURE کے بارے میں کچھ دلچسپ اور حیران کُن باتیں بتائیں گے۔

سوال یہ ہے کہ فطرت سے مراد کیا ہے؟ یا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں چیز فطری ہے تو اُس سے ہمارا مفہوم کیا ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مثلاً جب ہمیں بھُوک لگتی ہے اور پھر کچھ کھانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو یہ ایک فطری چیز ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو تمام جانداروں میں مشترک ہے۔ اسی طرح یہ خواہش کہ ہم زندہ رہیں اور انسانی نسل جاری وساری رہے یہ بھی ایک فطری خواہش ہے۔

اگر ہم اپنے اطراف میں پائی جانے والی چیزوں کا قریبی مشاہدہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی فطری ہیں مثال کے طور پر ــــ شکلیں۔ آپ شاید سوچتے ہوں کہ دنیا میں جتنی طرح کے جاندار اور پیڑ پودے پائے جاتے ہیں شاید اتنی ہی طرح کی شکلیں بھی پائی جاتی ہوں۔ آپ اگر ایسا سوچتے ہیں تو غلط سوچتے ہیں کیونکہ دنیا میں صرف چند طرح کی شکلیں پائی جاتی ہیں۔ اگلے صفحے پر موجود شکلوں کو دیکھئے اور پھر فطرت کے اندر پائی جانے والی ان شکلوں کے بارے میں سوچئے جو ان شکلوں سے ملتی جلتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے ہر شکل فطرت کے ایک سے زیادہ مظاہر میں موجود ہے مثال کے طور پر

پتّیاں، پھُول، پھل،
مچھلی، چڑیاں، بازو، پر، جسم کے حصّے، انڈے، چھلکے
بلور، اور پتھر وغیرہ۔

یہ کوئی اتفاق یا حادثہ نہیں ہے کہ یہ تمام شکلیں ایک جیسی ہیں۔ جانور، پودے حتیٰ کہ پہاڑ سب ہی دنیا کا حصّہ ہیں۔ ہم سب کو ایک ہی طرح کے حالات میں رہنا ہے۔ یعنی ایک ہی ہَوا، ایک ہی پانی اور ایک گرمی اور سورج کے زیرِ سایہ ان شکلوں میں سے ہر شکل اس کام کی مناسبت سے تشکیل پاتی ہے جو اُسے انجام دینا ہوتا ہے۔ مثلاً انڈا انڈے

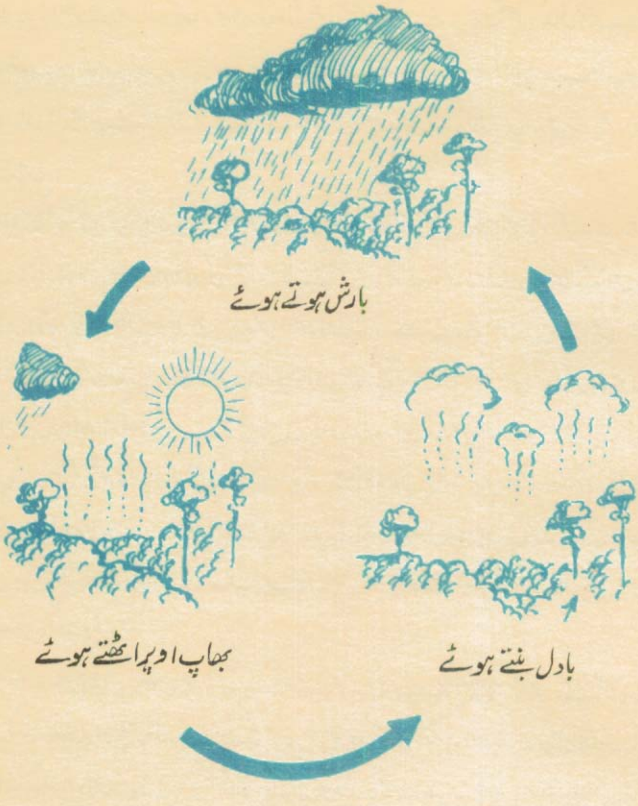

منطقہ حارہ کے جنگل میں بارش کے نظام کا خاکہ

کی طرح اِس لئے ہوتا ہے کہ اگر وہ گیند کی طرح ہو تو پھر شاید وہ اتنا مضبوط نہ ہو۔ اسی طرح پرندوں کے پَر اور ہوا میں اُڑنے والے کچھ بیج اپنی خاص شکلوں میں اس لئے ہیں کہ اُنہیں اُڑنے کا کام انجام دینا ہے۔

اگر آپ ان شکلوں کو غور سے دیکھیں گے تو ایک اور چیز کو نوٹ کریں گے اور وہ یہ کہ یہ تمام شکلیں اکثر متناسب ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس لئے اگر آپ اُن میں سے کسی ایک کو ٹھیک درمیان سے کاٹ دیں تو اُس شے کے دونوں حصّے آپ کو

ایک جیسے لگیں گے۔

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے دیکھا کہ ہر چیز کی کوئی نہ کوئی شکل ہوتی ہے۔ یہ بات محض اتفاق نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک مقصد ہے۔ تمام چیزوں کو خاص حالات میں رہنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔ مثلاً پرندے اُڑنے کے حوالے سے اور مچھلیاں پانی میں رہنے کے حوالے سے بنی ہیں۔ اس طرح کچھ جاندار شدید گرمی میں اور کچھ شدید سردی میں رہنے کے لئے بنے ہیں۔

دنیا کے مشہور ماہر حیاتیات چارلس ڈارون نے اس سلسلہ میں اُس فطری نظام کا تذکرہ کیا ہے۔ جس کے مطابق صرف وہی جاندار زندہ رہتے ہیں اور اُنہی کی نسلیں پروان چڑھتی ہیں جو کسی خاص ماحول میں رہنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ تمام جاندار ہلاک ہوجاتے ہیں جو کسی خاص ماحول میں رہنے کے لئے ناموزوں ہوتے ہیں۔ اس طرح گویا ڈارون صاحب کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فطرت تمام جانداروں کے لئے کچھ شکلوں کو مناسب خیال کرتے ہوئے منتخب کرلیتی ہے۔ یہ عمل تغیر MUTAION ـــــ کے نتیجے میں رونما ہوتا ہے۔ یعنی اگر تمام جاندار اسے بالکل اپنے ہی جیسے بچوں کو پیدا کریں تو ان میں کسی قسم کا تغیر رونما نہیں ہوسکتا۔ چونکہ زمین کا ماحول ہر لمحہ تبدیل ہوتا ہے اس لئے زندگی کی تمام صورتوں کو بھی تبدیل ہونا ہوتا ہے۔ اسی لئے تمام حیوانات کے یہاں ہر سال پیدا ہونے والے بچّے اپنے بھائیوں بہنوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کے اندر اپنے بھائیوں بہنوں سے مختلف خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر۔ مختلف رنگ، جسامت وغیرہ۔

گزشتہ بیس پچیس برسوں میں ایسے کیڑے مکوڑوں کو مارنے کے لئے کیمیکلز استعمال کئے گئے ہیں جو انسانوں کے لئے پیدا ہونے والے اناج کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ہم چوہوں کو بھی مختلف زہریلی دوائیاں کھلا کر ہلاک کرتے ہیں کیونکہ یہ ہمارے گھروں میں رہتے ہیں اور مختلف بیماریاں پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔ زہریلی دواؤں کے استعمال کے چند برسوں کے اندر ایسے چوہے اور کیڑے مکوڑے پیدا ہونے شروع ہوگئے جو ان زہریلی دواؤں کو کھا کر ہلاک نہیں ہوتے اس کا مطلب یہ ہے کہ اُنہیں مارنا مشکل ہے۔ چنانچہ اُنہیں مارنے کے لئے نئی اقسام کی زہریلی دوائیں ایجاد کی گئیں۔ تاہم اس کا امکان ہے کہ آئندہ برسوں میں ایسے چوہے اور کیڑے مکوڑے پیدا ہونے لگیں گے جو ان دواؤں کو کھا کر بھی ہلاک نہیں ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فطرت بڑے گروہوں والے ان جانداروں کی غیر فطری اموات سے اُن کا تحفظ کررہی ہے۔ چنانچہ ہمیں اپنی فصلوں وغیرہ کی حفاظت کے بارے میں غور کرتے ہوئے اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

جانداروں میں رونما ہونے والے تغیر کی ایک عمدہ مثال شمالی امریکہ میں پائی جانے والی ابابیلیں ہیں۔ یہ ابابیلیں ایسے صنعتی علاقوں میں رہتی ہیں جہاں پیڑ اور گھاس وغیرہ نہیں ہوتی۔ ان ابابیلوں کا فطری رنگ بھورا تھا۔ لیکن گزشتہ سو برسوں

ستارہ نما شکلیں

خط نما شکلیں

بیضوی شکلیں

گول شکلیں

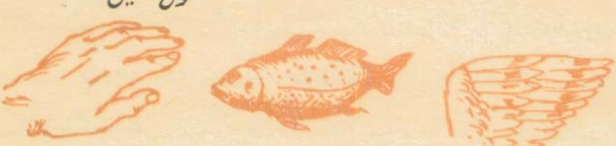

متحرک شکلیں

کے دوران ان کا رنگ کالا ہو گیا ہے ۔ ماہرین اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ صنعتی علاقوں کے دھوئیں سے بھرے ہوئے کالے ماحول میں اُن کا یہ رنگ اُن کے دشمنوں سے اُنہیں محفوظ رکھتا ہے ۔ اسی طرح ان علاقوں میں سیاہ تتلیاں بھی دیکھی گئی

ہیں۔ ماہرین کے مطابق سیاہ تتلیاں اُن علاقوں کے علاوہ پورے مُلک میں کہیں اور نہیں پائی جاتیں۔

جانوروں اور پیڑ پودوں میں رونما ہونے والی یہ تبدیلیاں مختلف علاقوں میں ایک ساتھ یا ایک ہی وقت میں رونما ہوسکتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان علاقوں کا مخصوص ماحول ایک دوسرے سے ملتا جُلتا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذکورہ تغیرات اتفاقی نہیں ہوتے بلکہ کچھ فطری قوتیں ان کے رونما ہونے کا سبب ہیں۔

فطرت زمین پر مختلف اقسام کی زندگی کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنی فطری قوتوں کو استعمال میں لاتی ہے۔ ہر خطّے میں موجود جانوروں اور پیڑ پودوں کے جہاں بہت سے دوست ہوتے ہیں۔ وہیں ان کے بہت سے دشمن بھی ہوتے ہیں۔ ہر جاندار کا اپنا ایک مقصد ہوتا ہے۔ کچھ جاندار دوسروں کو کھانے کے لئے ہوتے ہیں اور کچھ کھائے جانے کے لئے اور کچھ دونوں صورتوں کے لئے۔ چنانچہ زندگی کو پورے نظام کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہر طرح کے جاندار موجود رہیں۔ کیونکہ اگر ایک قسم کا جانور یا پیڑ پودا ختم ہوجائے گا تو اُس پر انحصار کرنے والا دوسرا جانور یا پیڑ پودا بھی باقی نہیں رہ سکے گا...

مثال کے طور پر برازیل میں بڑے پیمانے پر جنگل کاٹے گئے ہیں۔ چنانچہ وہ پرندے اور کیڑے مکوڑے جو ان درختوں پر رہتے تھے اور اُن سے اپنی خوراک حاصل کرتے تھے۔ وہ یا تو ہلاک ہوگئے یا پھر وہاں سے کہیں اور ہجرت کرگئے اس کے نتیجے میں وہ جاندار جو ان پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کو کھا کر زندہ رہتے تھے وہ بھی یا تو ہلاک ہوگئے یا کہیں اور چلے گئے۔ بڑے پیمانے پر درختوں کے کٹ جانے سے موسم میں بھی تغیرات آئے۔ یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ درخت پانی کو ہَوا میں تحلیل کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ درختوں سے خارج ہونے والا یہ پانی بھاپ کی صورت میں اُوپر جاکر بادلوں کی شکل اختیار کرتا ہے۔ جن سے بارش ہوتی ہے۔ درختوں کے بغیر بارش ہونا کم ہوگئی۔ جس کے باعث دوسرے پیڑ پودے ختم ہوگئے۔ ان علاقوں میں جن لوگوں نے فصلیں اُگانے کی کوشش کی وہ بُری طرح ناکام ہوگئے۔ کیونکہ وہاں کی زمین انتہائی خشک ہوچکی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ اپنی تمام زرخیزی کھو کر ریتلی زمین میں تبدیل ہوگئی ہے۔ تاہم اب اگر کچھ افراد اس زمین پر کچھ اُگانے میں کامیاب بھی ہوتے ہیں تو ان کی فصلوں کو کیڑے مکوڑے کھا جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کیڑے مکوڑوں کو کھانے والے پرندے یا تو ہلاک ہوچکے ہیں یا وہاں سے جاچکے ہیں۔

ان حقائق سے ہم یہی سمجھ سکے ہیں کہ اگرچہ زندگی کی مختلف شکلیں غذا اور رہنے کے لئے جگہ کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک دوسرے پر انحصار بھی کرتی ہیں۔ گویا کوئی جاندار دوسرے جاندار کے بغیر نہیں رہ سکتا، انسان بھی نہیں!

عید کارڈ

عمران مشتاق

عمر گھر کے بر آمدے میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی نظریں بار بار لیٹر بکس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ چلتے چلتے رک کر وہ تھوڑی دیر تک لیٹر بکس ہی کی طرف دیکھتا رہتا پھر مایوس ہو کر ٹہلنے لگتا۔ اِس کی امی لان میں بیٹھی فکر مندی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ "کاش آج کوئی خط نہ آئے۔ ...... بلکہ پوسٹ مین ہی نہ آئے اور اگر آئے تو کم سے کم وہ عید کارڈ نہ لائے۔" ان کا دل بار بار یہی دعا کر رہا تھا۔ ایسا کئی روز سے ہو رہا تھا۔ اور دیر ہوتے ہوتے ہی عمر بر آمدے میں ٹہل ٹہل کر پوسٹ مین کا انتظار شروع

کر دیتا اور وہ لان میں بیٹھیں اسے انتظار کرتا ہوا دیکھتیں۔

"اب آجاؤ، اتنے دن ہوگئے اب تو عید کارڈ آجانا چاہئے۔" عمر کی بڑبڑاہٹ انہیں سنائی دی۔ ان کی نگاہیں تو عمر پر ہی جمی ہوئیں تھیں اور ان کا ذہن بیتے ہوئے دن دہرانے لگا تھا۔ عمر کے ابّو ایک بڑی کمپنی میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ زندگی بڑی اچھی طرح سے گزر رہی تھی۔ چھوٹی سی تو فیملی تھی۔ عمر اس کے ابو اور وہ خود۔ عمر کے ابّو کی تنخواہ میں بڑی اچھی گزر بسر ہوتی تھی اور وہ نہایت خوش باش زندگی گزار رہے تھے کہ ان کا تبادلہ ہیڈ آفس کر دیا گیا۔ یہ چار مہینے پہلے کی بات تھی۔ ہیڈ آفس ان کے شہر سے کافی دور ایک دوسرے شہر میں تھا۔ ان کا جانا ضروری تھا اس لئے جانا پڑا۔ ان کے جانے پر عمر بہت رویا تھا۔ وہ اپنے ابّو سے بے حد قریب تھا لیکن وہ انہیں ساتھ نہ لے جاسکتے تھے کیونکہ عمر کے چھٹی جماعت کے امتحانات اس وقت ہونے والے تھے ...... اس لئے یہ طے کیا گیا کہ جیسے ہی عمر کے امتحانات ختم ہوں گے وہ وہاں سے شفٹ ہوجائیں گے۔ ہیڈ آفس جانے کے کچھ دنوں بعد ہی وہ ایک مشکل کا شکار ہوگئے۔ ان کے جونیئر اکاؤنٹنٹ نے کافی روپیہ غبن کر لیا اور کچھ ایسا چکر چلایا کہ پھنس وہ گئے۔ مالک نے ان کی بات کا بالکل یقین نہ کیا اور کیس پولیس کے حوالے کر دیا۔ روپیہ نہ مل سکا۔ کیس عدالت تک گیا اور پھر انہیں ایک سال کی سزا ہوگئی۔ جس دن انہیں سزا سنائی گئی اس دن عمر کی امی بہت روئی...... تھیں۔ عمر بار بار پوچھتا۔

"امی کیا ہوا، آپ کیوں رو رہی ہیں؟" لیکن جواب میں ان کے پاس صرف آنسو تھے جو بہتے رہے تھے۔ انہوں نے عمر کو تین دن کے لئے اس کے چچا کے پاس بھیج دیا اور خود عمر کے ابو سے ملاقات کے لئے دوسرے شہر چلی گئیں۔ ان سے ملنے کے بعد دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ عمر کو کچھ نہ بتایا جائے ورنہ اس کے ذہن پر بُرا اثر پڑے گا۔ وہ اپنے ابّو سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ اس کے دل میں یہ محبت ہمیشہ رہے۔ عمر اپنے ابّو کو آئیڈیل سمجھتا تھا۔ جب اسے پتہ چلتا کہ اس کے ابّو کو جیل ہوگئی تو شاید اس کے دل میں نفرت پیدا ہوجاتی۔ کیونکہ وہ بہت حسّاس بچّہ تھا اور ہر بات کا اثر جلد قبول کر لیتا تھا۔ اس لئے انہوں نے عمر سے ہر بات چھپائی تھی۔ جب چند دن پہلے انہیں عمر نے بتایا کہ اس نے ابو کو عید کارڈ پوسٹ کر دیا ہے تو وہ پریشان ہوگئیں۔ انہوں نے عمر کے ابّو کو ایک خط لکھا تھا جو ان کو مل نہ سکا تھا۔ وہ ان کی کمپنی کے ایڈرس پر اس وقت پہنچا تھا جب انہیں سزا ہو چکی تھی۔ کمپنی کی طرف سے وہ خط وصول نہیں کیا گیا تھا اور واپس مل گیا تھا۔ اب وہ اسی لئے فکر مند تھیں کہ اگر عید کارڈ واپس آگیا تو عمر کو سمجھانا مشکل ہوجائے گا۔ وہ ہر بات جاننا چاہے گا "ارے آگیا پوسٹ مین آگیا! عمر

کی چیختی ہوئی آواز نے ان کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔ وہ چونک اٹھیں۔ عمر دوڑتا ہوا لیٹر بکس کی طرف جارہا تھا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ لیٹر بکس میں ڈالا اور جب ہاتھ باہر نکالا تو اس میں عید کارڈ تھا "ارے یہ تو ابّو کا عید کارڈ ہے۔" عمر وہیں سے چلّایا۔ ان کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ وہ دوڑتا ہوا ان کے پاس آیا اور ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر بے صبری سے لفافہ کھولنے لگا۔ لفافہ پھاڑ کر عید کارڈ نکالا اور جلدی جلدی پڑھنے لگا "واپس آئے ہوئے عید کارڈ کو بھی یہ کتنے شوق سے پڑھ رہا ہے۔" انہوں نے حیرانگی سے سوچا۔

"امی آپ بھی پڑھیں دیکھیں ابو نے کیا لکھا ہے۔" عمر نے عید کارڈ ان کے ہاتھوں میں دے دیا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انہوں نے عید کارڈ کو بیچ سے کھولا اور اندر نظر پڑتے ہی انہیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ تیزی سے پڑھتی چلیں گئیں لکھا تھا۔

"پیارے بیٹے عمر سدا جیو۔ تمہارا عید کارڈ ملا۔ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ ہم نے چونکہ تم سے یہ بات چھپائی تھی اس لئے عید کارڈ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ حیرانی اس وقت دور ہوئی جب عید کارڈ پڑھا تو پتہ چلا کہ تم نے اپنی امی اور چچا نیاز کی باتیں سن لیں تھیں۔ اس طرح تمہیں معلوم ہوا کہ میں یہاں سینٹرل جیل میں ہوں۔ سینٹرل جیل کا پتہ تم نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا اور یہ کہ تم ناراض ہو کہ تم سے یہ سب باتیں کیوں چھپائی گئیں۔ میرے بیٹے زندگی میں انسان پر کبھی کبھی ایسا وقت آتا ہے کہ جو شخص ایمانداری اور نیک نیتی سے زندگی گزارنا چاہے اس کی راہ میں ایسی مشکلات آتی ہی رہتی ہیں۔ میں نے بھی ہمیشہ سچائی کا دامن تھامے رکھا، مکر و فریب سے ہمیشہ بچنے کی کوشش کی۔ یہ میرا امتحان ہی تو ہے کہ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی میں آج جیل میں بند ہوں۔ میں نے ہمیشہ تمہیں سچی اور اچھی باتیں بتائیں ہیں۔ انسان پر چاہے کتنی ہی مشکلات کیوں نہ آن پڑیں اسے گھبرانا نہیں چاہئے۔ میں تمہیں آج پھر یہی تلقین کرتا ہوں کہ ہمیشہ سچ بولو نیکی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دو۔ برائی سے ہمیشہ بچو اور مشکل حالات میں برائی کا ڈٹ کر مقابلہ کرو اور اپنے بڑے سے بڑے نقصان کی پرواہ نہ کرو۔ میں آج مشکل میں ہوں پھر بھی تم سے یہی کہوں گا جو ہمیشہ کہتا آیا ہوں۔ مشکلات دیکھ کر انسان کو اپنے اصول نہیں بدلنے چاہئیں مجھے اپنے اللہ پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ کسی بھی وقت میری بے گناہی ثابت کردے گا۔ میں مایوس نہیں ہوں عید قریب ہے اس بار عید پہ میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں گا۔ انشاء اللہ آئندہ سال عید ہم اکٹھے منائیں گے۔ اپنی امی کو پریشان نہیں کرنا بہادر بیٹا بن کر رہنا۔ اللہ تمہیں ایسی ہزاروں عیدیں نصیب فرمائے۔ تمہیں اتنی مسرتیں دے کہ تم سے سنبھالی نہ جائیں۔ اپنی امی کو بھی عید

کی مبارکباد دے دینا۔ مجھے امید ہے کہ تم میری امیدوں پر پورا اترو گے۔ اب تم سے اجازت چاہوں گا اللہ حافظ۔ فقط تمہارا ابّو" عمر نے دیکھا اس کی امی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ امی کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولا "امی مجھے پورا یقین ہے کہ ابّو بے گناہ ہیں وہ جھوٹ نہیں بولتے۔ آپ بھی پورا یقین رکھیں ابّو ایسا بُرا کام ہرگز نہیں کر سکتے۔ وہ جلد ہمارے پاس آجائیں گے" انہیں ایسا محسوس ہوا کوئی بڑا بوجھ ان کے ذہن سے اتر گیا ہو وہ اسے گلے سے لگا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

"بیٹے اس عید پہ تمہارے ابّو ہمارے پاس نہیں ہوں گے لیکن ان کا تصور ان کے اعتبار کا پیکر بن کر ہمارے پاس ہو گا...... جو ہمیں ان کی موجودگی کا احساس دلائے گا" ان کی آنکھوں سے دو آنسو عمر کے بالوں پہ گرے اور جذب ہو گئے۔

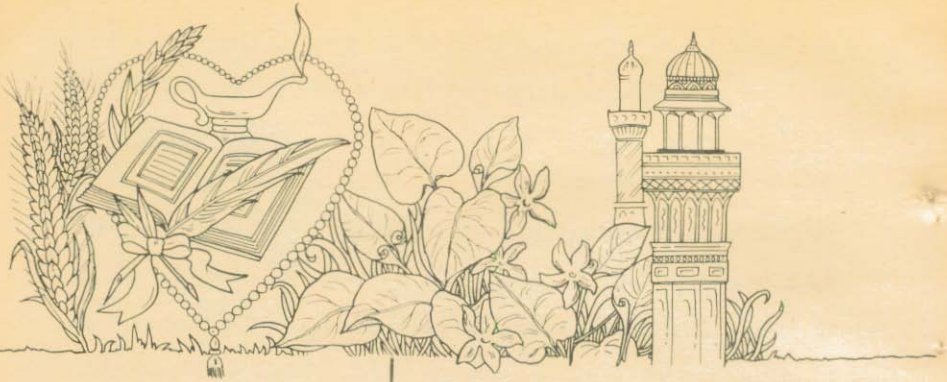

روزہ

ساجد سعید

رحمتوں کے انعام سمیٹنے کا مہینہ

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے عبادت کے جتنے بھی طریقے بتائے ہیں ان میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور پوشیدہ ہے۔ مثال کے طور پر نماز ہی کو لیجئے۔ اس سے نہ صرف آپ برائیوں سے بچتے ہیں بلکہ جسمانی لحاظ سے بھی آپ دن بھر پاک وصاف رہتے ہیں۔ اسی طرح روزہ بھی ایک ایسی عبادت ہے جس سے مسلمان اللہ سے لو لگاتا ہے اور چھوٹے اور بڑے گناہوں سے بچتا ہے جہاں اللہ نے نماز کے بارے میں فرمایا ہے کہ "نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے"۔ وہاں روزوں کے بارے میں بھی فرمایا کہ "اے ایمان والو ! تم پر روزے فرض کئے گئے جس طرح تم سے پہلے کے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم متقی اور پرہیز گار بنو۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر عبادت کے کچھ قواعد و ضوابط رکھے ہیں۔ مثلاً نماز پڑھتے ہوئے اگر آپ گفتگو کرتے ہیں تو آپ کی نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر آپ یا آپ کے بڑے زکواۃ کسی غیر مستحق کو دے دیتے ہیں تو یہ زکواۃ بے کار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح روزہ بھی ہے۔ آپ روزہ رکھ لینے کے بعد اگر غیبت، چوری، بہتان ، بدگمانی اور جھوٹ وغیرہ جیسی برائیوں سے بچنے کی کوشش نہیں

کرتے تو پھر اللہ کو آپ کی اس بھوک پیاس کی ضرورت بھی نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ "جو شخص جھوٹ اور غلط کاموں کو ترک نہیں کرتا خدا کو اس کی بھوک اور پیاس کی کوئی ضرورت نہیں"۔

روزہ نام ہے صبح صادق سے غروب آفتاب تک کچھ نہ کھانے پینے کا۔ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس کا تعلق صرف بندے اور اللہ کے درمیان ہوتا ہے۔ دوسری عبادات مثلاً نماز، زکواۃ وغیرہ ظاہری عبادات ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ روزہ کی حالت میں ہیں اس حالت میں نماز کے لئے آپ وضو کرتے وقت کچھ پانی حلق میں اتار لیتے ہیں تو یقیناً اس کا علم سوائے خدا کے کسی کو نہ ہو سکے گا لیکن آپ کا روزہ تو بہر حال ٹوٹ ہی جاتا ہے۔ یاد رکھیئے کہ روزہ آقا و غلام کے درمیان ایک راز ہے۔ حدیث میں ہے کہ "روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا اجر دونگا۔"

روزے کا دوسرا مقصد اپنی خواہشات پر قابو پانا ہے۔ یعنی روزہ انسان کو مشکلات و مصیبتوں سے مقابلہ کرنے کا درس دیتا ہے۔ صبح سے شام تک انسان شدید بھوک و پیاس میں بھی اللہ کے خاطر صبر کرتا ہے جس سے اس کے اندر سکون برداشت، حوصلہ، اور نیک خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ وقت بے وقت کھانا معدے کے مختلف امراض پیدا کر دیتا ہے۔ معدے کو کچھ وقت آرام بھی کرنا چاہئے۔ سال بھر میں رمضان ایک ایسا مہینہ ہے جو معدے کو درست حالت میں رکھنے کا کام بڑی اچھی طریقے سے سرانجام دیتا ہے۔ خود آپؐ کا ارشاد ہے کہ "روزہ بدن کی زکواۃ ہے"۔ مطلب یہ کہ جس طرح صاحب استطاعت آدمی کے زکواۃ دینے سے اس کا مال پاک ہو جاتا ہے اسی طرح روزہ رکھنے سے جسم بھی مختلف بیماریوں سے پاک رہتا ہے۔ روزہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ روزہ انسان کو پورے دن مسلسل اللہ کی یاد میں مشغول رکھتا ہے۔ پانچوں نمازیں اور مختلف ذکر و اذکار میں انسان عادتاً مشغول رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا ایمان ترو تازہ رہتا ہے۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ صرف کھانے پینے سے پرہیز کا نام روزہ نہیں بلکہ کبیرہ گناہوں جیسے لڑائی جھگڑوں، گالی گلوچ، مکرو فریب اور چھینا جھپٹی جیسی عادتوں سے بچنے کا نام روزہ ہے۔

آپؐ کا فرمان ہے کہ "جب تم میں سے کوئی روزے سے ہو تو اسے بد زبانی، کج روی اور جہالت سے باز رہنا چاہئے۔ ہاں اگر کوئی شخص روزے دار کے ساتھ زیادتی کرے تو اسے کہہ دینا چاہئے کہ ! میں تو روزے سے ہوں"۔

یہ فضیلت اور مرتبہ بھی روزے دار کے حصے میں آیا کہ ماہ رمضان کے آخری دس دنوں کی

طاق راتوں یعنی اکیس، تئیس، پچیس، ستائیس اور انتیس کی راتوں میں ایک رات ایسی مقدّس اور برکت والی ہے جس کی عبادت ہزار مہینے کی عبادت سے بہتر ہے۔ اس رات جبرائیلؑ فرشتوں کے ہمراہ بندگان خدا کو اپنے آقا کے حضور محو عبادات دیکھنے کو زمین پر اترتے ہیں۔ اس رات بہت سے نیک اور پرہیزگار لوگوں کی دعائیں بھی سنی جاتی ہیں۔

یہ سب فائدے ہمارے ہی لئے ہیں۔ اس میں خدا کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ تو اپنے بندوں کو عبادتوں کے بدلے میں بہت کچھ عطا کرتا ہے۔ روزہ ہر عاقل و بالغ پر فرض کیا گیا ہے۔ اب یہ ہمارے اوپر ہے کہ ہم کس طرح اور کیسے اس فرض سے سبکدوش ہوں۔ اس فرض کو جو لوگ بغیر کسی معقول وجہ کے ادا نہیں کرتے وہ اپنے اوپر خود ظلم کرتے ہیں۔ رمضان میں افطاری اور سحری کرنے کا علیحدہ ثواب ہے۔ آپؐ نے افطار کے بارے میں فرمایا کہ "جس نے کسی روزے دار کو روزہ افطار کروایا تو یہ افطاری اس کے گناہوں کی بخشش اور اسے دوزخ سے بچانے کا ذریعہ ہوگی"۔ اگر کسی کے پاس اس بات کی گنجائش نہیں کہ وہ کسی روزے دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا دے تو اس کے بارے میں فرمایا کہ "خدا یہ ثواب اس شخص کو بھی برابر عطا کرتا ہے جو ایک کھجور، پانی کے ایک گھونٹ یا دودھ کے ایک گھونٹ سے کسی روزے دار کو افطار کرا دے"۔

آپؐ نے افطاری کے بارے میں مزید فرمایا کہ "خدا تعالیٰ کو وہ بندہ سب سے زیادہ محبوب ہے جو افطاری میں جلدی کرتا ہے۔" یعنی افطاری کے متعلق ان ارشادات سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں انسان خود پیٹ بھر کر افطار کرتا ہے وہاں اگر وہ کسی دوسرے مسلمان کو اپنی استطاعت کے مطابق افطار کروا دے تو اس کو اس عمل کا دوگنا ثواب مل جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جلدی افطار کرنا بھی سنت نبویؐ میں شامل ہے۔ افطار اور سحری کی خوراک اگرچہ ویسی ہی ہوتی ہے جو ہم روزانہ استعمال کرتے ہیں لیکن وہی خوراک رمضان کے مہینے میں ہمارے لئے برکت کا باعث ہو جاتی ہے۔

روزے کی مختلف قسمیں ہیں۔ جس میں فرض، واجب، سنت، نفل، مکروہ اور حرام کے مختلف درجات ہیں۔ رمضان کے روزے فرض ہیں، نذر اور کفارے کے روزے واجب ہیں۔ اگر کسی متعین دن کے روزے کی نذر مانی جائے تو اس دن روزہ رکھنا واجب ہوگا۔ جو روزے آپؐ نے خود رکھے ہیں یا جن کے رکھنے کی آپؐ نے ترغیب دی وہ روزے سنّت میں شامل ہیں۔ جیسے یوم عرفہ کا روزہ، عاشورے کے روزے یعنی محرم کی نویں اور دسویں تاریخ کے روزے۔ اسی طرح نفلی روزے ہیں جن میں ماہ شوال کے چھ روزے، پیر اور جمعرات کا روزہ، ذوالحج کے ابتدائی عشرے کے آٹھ

روزے شامل ہیں۔ اسی طرح ماہ شعبان کی پندرہویں تاریخ کا روزہ بھی نفلی روزوں میں شامل ہے۔ سال میں چھ روزے رکھنا حرام ہیں عید الفطر کے دن کا روزہ، عید الاضحیٰ کے دن کا روزہ ایام تشریق اور ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذوالحجہ کے روزے کچھ باتیں روزے کی حالت میں ایسی ہیں جن کے کرنے سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے جیسے قصداً کوئی چیز کھالینا، کسی نے غروب آفتاب سے پہلے یہ سمجھ کر روزہ افطار کر لیا کہ سورج غروب ہو چکا ہے تو اسی صورت میں قضا واجب ہو گی کسی نے روزے کی نیّت ہی نہیں کی اور پورے دن کھانے پینے سے پرہیز کرتا رہا تو اس صورت میں بھی قضا لازم ہو گی۔ قصداً منہ بھر کے قے کرنا، کان میں تیل ڈالنا، دانتوں میں سے نکلے ہوئے خون کو پی لینا، یہ سمجھنا کہ ابھی صبح صادق نہیں ہوئی سحری کھالی پھر معلوم ہوا کہ صبح ہو چکی تھی وغیرہ ان تمام صورتوں میں روزہ رکھنا واجب ہو جاتا ہے۔ ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے اس فرض کو ذمہ داری سے ادا کرے تاکہ آخرت میں اس کو دنیا میں یہ بویا ہوا پھل مل سکے۔

کوڑے دان کی دردمندانہ اپیل

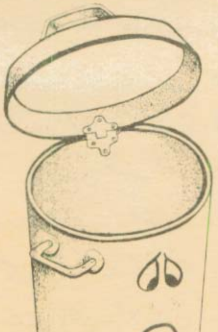

سب کو اپنا حق عزیز ہوتا ہے۔
کوڑا کرکٹ میرا حق ہے
میرے حق کو گلی میں مت پھینکیے۔
مجھے میرا حق دیجیے۔
ورنہ!
مکھیوں، مچھروں اور صفائی پسند
پڑوسیوں سے روزانہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیے۔

کبوتر اور شکرا

پیرزادہ مولوی محمد حسین ایم اے

کبوتر کو شکرا دبائے ہوئے گھسا کھیت میں جا کے دہقان کے
تعاقب کی دُھن میں نہ آیا نظر کہ لٹکا ہُوا جال تھا بانس پر
وہ اُڑتا ہُوا جال میں جا پھنسا جو دہقاں نے دیکھا بہت پھر ہنسا
لگا توڑنے جبکہ گردن کساں کہا بے گناہ ہوں بچا میری جاں
نہیں جب کیا میں نے تیرا قصور تو پھر کس عداوت کا ہے یہ ظہور
کہا اُس کو دہقاں نے تو ہی بتا کبُوتر نے کیا کی تھی تیری خطا

یہ قولِ مسیح پُراشفاق ہے یہ ہی اصل تہذیبِ اخلاق ہے
جو اُمید تم رکھتے ہو غیر سے اُسی کے مطابق کرو غیر سے
جو ہو خلق اس قول پر کاربند نہ پہنچائے انساں کو انساں گزند
کرو غیر کے حق میں بیجا جو کام تو لو سوچ پہلے بغورِ تمام
کہ اُس کی جگہ آپ ہوتے اگر تمہاری جگہ پر وہ ہوتا بشر
یہی کام اُس کا پھر اے پُرصفا تمہیں ہوتا معلوم کتنا بُرا

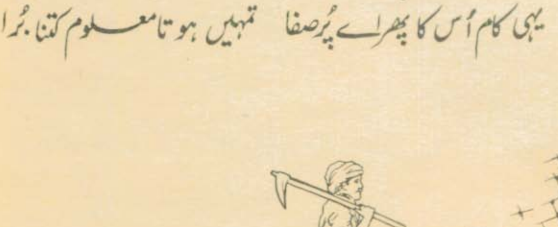

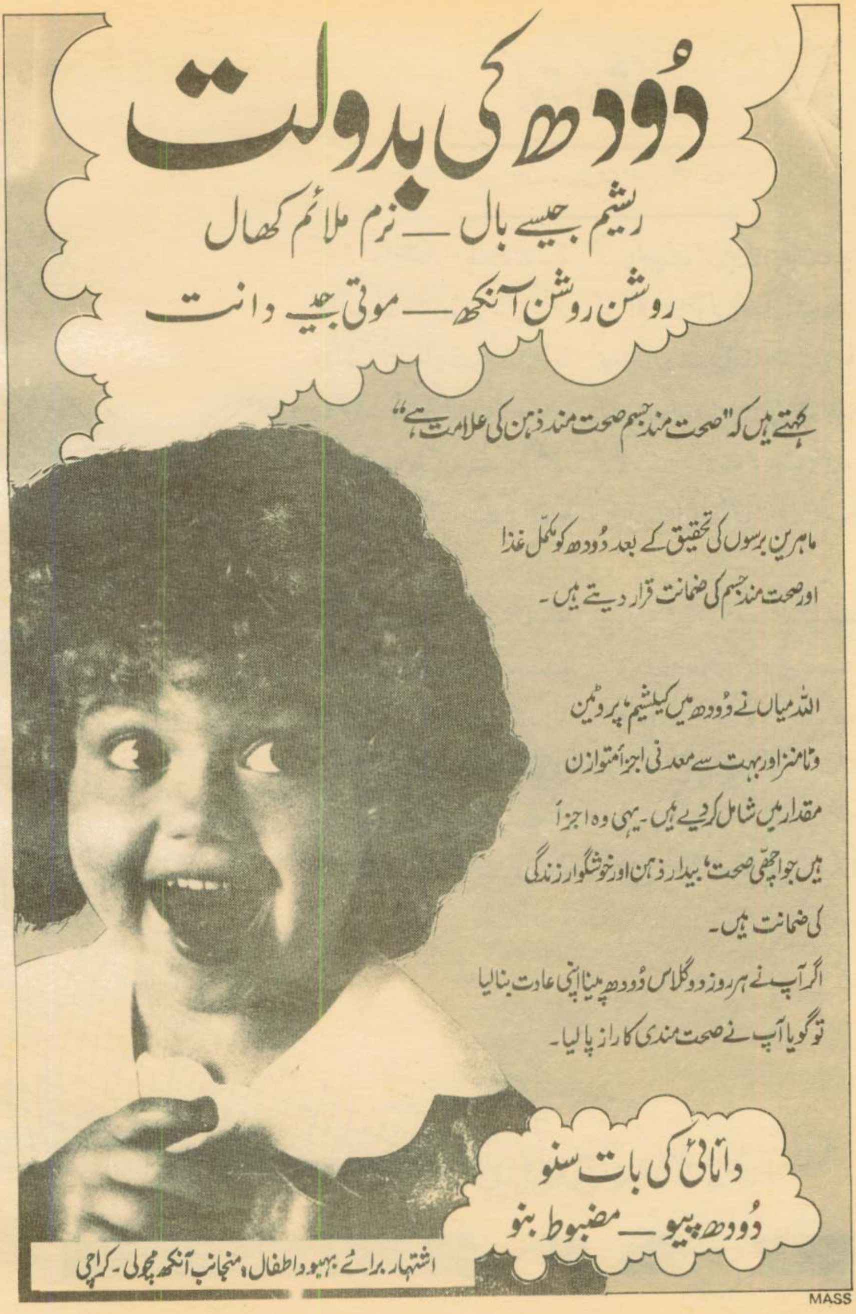
دُودھ کی بدولت
ریشم جیسے بال — نرم ملائم کھال
روشن روشن آنکھ — موتی جیسے دانت
کہتے ہیں کہ "صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہے"
ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد دُودھ کو مکمّل غذا اور صحت مند جسم کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔
اللہ میاں نے دُودھ میں کیلشیم، پروٹین وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا متوازن مقدار میں شامل کر دیے ہیں۔ یہی وہ اجزاً ہیں جو اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہیں۔
اگر آپ نے ہر روز دو گلاس دُودھ پینا اپنی عادت بنا لیا تو گویا آپ نے صحت مندی کا راز پا لیا۔
دانائی کی بات سنو
دُودھ پیو — مضبوط بنو
اشتہار برائے بہبود اطفال، منجانب آنکھ مچولی - کراچی
MASS

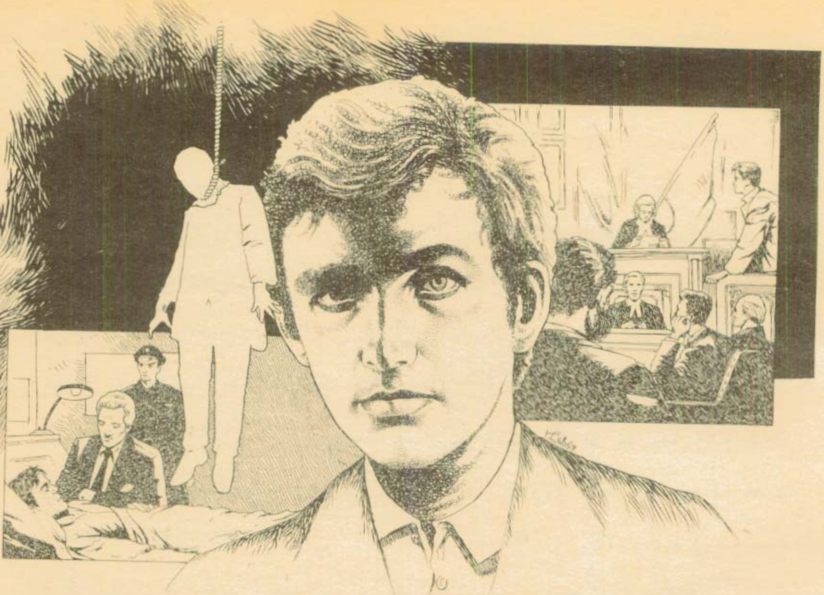

معجزہ

سیّد خورشید عالم

اسے پھانسی کے تختے پر لٹکایا جا چکا تھا کہ ایک معجزہ رونما ہو گیا......

امریکہ ان دنوں خانہ جنگی کا شکار تھا۔ جس کے نتیجے میں لوگوں میں عدم تحفظ اور بے چینی پائی جاتی تھی۔ دہشت گردی کی کارروائیوں اور جرائم میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ جرائم پیشہ گروہ جب اور جہاں چاہتے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیتے۔ مس پی میں ان دنوں وہائٹ کیپس نامی جرائم پیشہ گروہ نے ایک زمیندار ول بکلے کے ایک کاشت کار نیگرو کو بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا۔ ول بکلے اور اس کے بھائی جم نے معاملہ عدالت تک پہنچایا تاکہ نیگرو کو انصاف مل سکے۔اس پر مشتعل ہو کر وائٹ کیپس نے بکلے برادران کو سنگین نتائج کی دھمکی دی۔ اگلے روز جب جم اور ول بکلے عدالت میں

اپنا بیان لکھوانے کے بعد گھر آرہے تھے تو جھاڑیوں میں چھپے ہوئے وائٹ کیپس کے غنڈوں نے ان پر فائر کھول دیا۔ ول بکلے تو اسی وقت ہلاک ہو گیا۔ جب کہ جم وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے بعد میں گواہی دی کہ ول بکلے کو ول پروس نے گولی ماری ہے۔ چنانچہ ول پروس گرفتار کرلیا گیا۔ ول پروس کے تین رشتہ داروں اور دو پڑوسیوں کا کہنا تھا کہ جس وقت بکلے پر حملہ ہوا ہے اس وقت تو ول پروس گھر میں موجود تھا۔ اس کے گھر کی تلاشی لی گئی تو وہاں سے ایک شاٹ گن بھی بر آمد ہوئی۔ مگر اسے کئی مہینوں سے استعمال بھی نہیں کیا گیا تھا۔ لہٰذا ول پروس کسی بھی طرح مجرم ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر جیوری کو رشتہ داروں اور پڑوسیوں کی گواہی پر شک تھا۔ چنانچہ جیوری نے فیصلہ دیا کہ ملزم ول پروس قتل کا مجرم ہے چنانچہ اسے پھانسی کی سزا کا حکم سنا دیا گیا۔

۷ فروری ۱۸۹۴ء کی صبح تین ہزار سے زائد عورتیں، بچے اور مرد عدالت کے باہر پھانسی کا منظر دیکھنے جمع ہو گئے علاقے کا شیرف بھی اپنے نائبین کے ہمراہ اس موقع پر موجود تھا پھانسی کے انتظامات مکمل تھے۔ جلاد بھی ایک طرف کھڑا اپنی "باری" کا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر بعد ول کو پھانسی کے تختے پر لایا گیا۔ ڈپٹی شیرف نے اس کے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیئے۔ اس کے بعد اس کے پاؤں بھی باندھ دیئے گئے۔ شیرف نے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا۔

"کیا تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟" تب ول پروس کی آواز گونجی۔

"میں نے کوئی قتل نہیں کیا ہے..... میں بے گناہ ہوں۔ مجھے جرم سے نفرت ہے..... میں قتل جیسا بھیانک جرم کر ہی نہیں سکتا۔" مجمع میں چند لمحے سرگوشی ہوتی رہی۔ ان میں سے بہتیرے لوگ ول پروس کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ وہ اس بات کو ماننے پر تیار ہی نہ تھے کہ یہ اکیس سالہ نوجوان وائٹ کیپس جیسے مجرموں کے گروہ میں شامل ہو سکتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جلاد نے آگے بڑھ کر چمڑے کا ایک خول ول پروس کے سر پر اس طرح چڑھایا کہ اس کا پورا چہرہ چھپ گیا۔ شیرف نے چند لمحے کا انتظار کیا اور آگے بڑھ کر ایک لیور کھینچ لیا۔ ایک جھٹکے سے ول پروس کا جسم فضاء میں معلق ہو گیا۔ مجمع میں خواتین کی چیخیں نکل گئیں۔ کچھ عورتیں رونے لگیں۔ اس سارے عمل کے دوران بمشکل چند لمحے ہی گزرے تھے کہ اچانک ایک معجزہ رونما ہو گیا۔ ول پروس کا پھندا خود بخود پھسل گیا اور وہ نیچے آرہا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ویسے ہی بندھے ہوئے تھے۔ اسی طرح اس کے سر پر چمڑے کا خول بھی چڑھا ہوا تھا۔ اس کے جسم کی معمولی سی حرکت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ابھی اس میں زندگی باقی ہے۔ چنانچہ پھانسی کی

سزا مکمل کرنے کے لئے شیرف نے اپنے دو آدمیوں کو اشارہ کیا کہ وہ ول پروس کو دوبارہ پھانسی کے تختے پر لائیں۔ ابھی شیرف کے آدمی آگے بڑھے ہی تھے مجمع میں ایک آواز گونجی۔

"لوگو...... ول پروس بے گناہ ہے۔ خدا کبھی بے گناہوں کو اس طرح سزا نہیں دلوا سکتا۔ اس کی قدرت نے ظاہر کر دیا ہے۔ کہ ول پروس بے گناہ ہے۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔" یہ قصبے کے پادری کی آواز تھی۔

"نہیں نہیں...... ہم ول پروس کو پھانسی نہیں ہونے دیں گے۔" "ہم یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتے۔" "یوں بھی کسی شخص کو ایک جرم کی دو بار سزا نہیں دی جاسکتی۔" مجمع سے کئی افراد کی آواز گونجی۔ شیرف کے جانبدارانہ اور سخت رویئے کی بنا پر مجمع بُری طرح بھر چکا تھا۔ چنانچہ شیرف نے اپنے آدمیوں کو ول پروس کو اٹھا کر جیل لے جانے کا اشارہ کیا۔ اور خود بھی وہاں سے کھسک گیا۔ اگلے روز گورنر نے اس واقعے کی تحقیقات کا حکم دے دیا کہ قتل کا مجرم پھانسی کے پھندے سے کس طرح بچ نکلا۔ گورنر کا خیال تھا کہ معجزے کی بات تو کمزور عقیدے کے لوگ کرتے ہیں۔ جب کے مجرم کے بچ نکلنے میں کسی سازش کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ گورنر کے خیال میں اسے دوبارہ پھانسی دی جانی چاہئے۔ تحقیقات سے یہی پتا چلا کہ جو کچھ پھانسی کے تختے پر ہوا وہ کسی سازش کے تحت نہیں بلکہ قدرت کی طرف سے ایک معجزہ تھا۔ ایسا معجزہ جس میں ایک بے گناہ کئی سیکنڈ فضاء میں معلق رہنے کے بعد بھی زندہ رہا۔ مقدمہ چلتا رہا ول پروس کا وکیل اس کے مقدمے کی پیروی کرتا رہا۔ مگر سپریم کورٹ نے ۱۲ دسمبر ۱۸۹۵ء کو فیصلہ سنا دیا کہ ول پروس کو دوبارہ پھانسی دی جائے گی۔

مگر اب رائے عامہ اس عدالتی فیصلے کے خلاف سراپا احتجاج بن گئی۔ خوف خدا رکھنے والے بہت سے افراد نے اس فیصلے پر اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کیا کہ "یہ قدرت کے فیصلے کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔" "خدا اس بار بھی اپنے بے گناہ بندے کو بچا لے گا۔" "ہم یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتے۔" چنانچہ عوام کا غیض وغضب دیکھتے ہوئے ایک سرکاری حکم کے تحت ول پروس کو کولمبیا جیل سے منتقل کر کے اس کے آبائی علاقے کی ایک خستہ حال جیل میں لے جایا گیا۔ مگر چند روز بعد ہی چند افراد پر مشتمل ایک گروہ جیل پر حملہ آور ہوا۔ گروہ نے جیل کے گارڈز کو غیر مسلح کر کے ان کو بے بس کر دیا۔ اور اس طرح وہ لوگ ول پروس کو آزاد کرا کر قریبی پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔

گورنر نے ول پروس کی نشاندہی یا پکڑ کر لانے والے کے لئے بھاری انعام کا اعلان کیا۔ سب لوگ ہی یہ جانتے تھے کہ۔ جیل پر حملہ کرنے والے افراد کون تھے۔ یا یہ کہ ول پروس کہاں روپوش ہے۔ مگر کوئی بھی اعلیٰ حکام کے سامنے اطلاع دینے نہیں گیا۔

انہیں دنوں انتخابات ہو رہے تھے۔ چنانچہ جب نیا گورنر منتخب ہوا تو اس نے عوام کے جذبات اور خیالات کو دیکھتے ہوئے ول پروس کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا۔ وقت گزرتا رہا۔ دو سال بعد ہزاروں افراد کے دستخط سے ایک اور درخواست عدالت میں پیش کی گئی۔ خاص بات یہ تھی کہ اس درخواست کی پیروی ڈسٹرکٹ اٹارنی نے کی۔ عام طور اٹارنی حضرات حکومت کے وکیل ہوتے ہیں اور وہ عوامی مقدمات کی پیروی کرتے ہیں۔ چنانچہ ول پروس کی سزا معاف ہو گئی۔ چنانچہ وہ اپنے آبائی قصبے میں پہنچ کر کھیتی باڑی کا کام دوبارہ کرنے لگا۔ کچھ عرصے بعد اس نے شادی کر لی اور زندگی کے بقیہ دن اپنے علاقے میں ہنسی خوشی بسر کئے۔

○

کہانی بظاہر ختم ہو جاتی ہے۔ مگر ۱۹۱۹ء میں اس حیرت انگیز کہانی کا ایک اور موڑ سامنے آتا ہے۔ جب ایک بوڑھے شخص نے اپنے مرنے سے پہلے اقرار جرم کرتے ہوئے کہا کہ اس نے ایک اور شخص کے ساتھ مل کر ول بکلے کو گولی ماری تھی۔ اس نے اپنے اور اپنے ساتھی کے بارے میں اعتراف بھی کیا کہ دونوں کا تعلق وائٹ کیپس کے گروہ سے تھا۔ جلد ہی یہ خبر پورے مس سی پی میں پھیل گئی۔ چنانچہ چند دنوں کے بعد حکومت کی طرف سے ول پروس کو پانچ ہزار ڈالر کی رقم موصول ہوئی۔ یہ رقم دراصل حکومت نے تلافی کے طور پر ادا کی تھی۔ کیوں کہ عدلیہ کے غلط فیصلے کی بناء پر ایک شخص کو کئی برسوں تک اذیت برداشت کرنی پڑی۔

۱۹۴۳ء میں ول پروس کا انتقال ہوا۔ وہ اپنے پورے علاقے میں نہایت معزز شخصیت بن چکا تھا۔ اس کے گیارہ بچوں کو بھی علاقے میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ایک بار ول پروس نے اپنی بیوی اور بچوں کو کہا تھا۔

"جب میرے مقدمے کی سماعت کے بعد سزائے موت کا حکم سنایا گیا تو مجھے پورا یقین تھا کہ میرا خدا مجھے ضرور بچا لے گا۔ کیونکہ میں بے گناہ تھا۔ مجھ پر جھوٹا مقدمہ قائم کیا گیا چنانچہ میرے خدا نے میری دعا سن لی اور مجھے بچا لیا۔"

لائبریری آف کانگریس (امریکہ)

پانچ سو میل لمبی لائبریری

ارشد شاہین

آپ کی لائبریری میں کتنی کتابیں ہیں؟ ...... کیا کہا؟ آپ کی کوئی لائبریری نہیں ہے۔ بھئی حیرت ہے آپ کے پاس کچھ کتابیں تو ضرور ہوں گی کورس کی، کچھ کہانیوں کی، کچھ اچھے اچھے رسالے، کچھ معلوماتی کتابیں وغیرہ، وغیرہ...... ہاں تو بس انہیں ترتیب دے لیجئے آپ کی لائبریری تیار ہو گئی۔ بے شک یہ ایک چھوٹی سی لائبریری ہوگی۔ لیکن ہمیشہ ہی سے بڑے سفر کا آغاز ایک چھوٹے سے قدم سے ہوا ہے۔

آیئے آپ کو ایک لائبریری کی سیر کرائیں جو ایک عام لائبریری سے ترقی کرتے کرتے آج دنیا کی سب سے بڑی لائبریری بن گئی ہے۔

۱۹۸۷ء کی بات ہے کہ اداکار واٹرزٹن ٹی وی کی ایک منی سیریل میں ابراہیم لنکن کا کردار ادا کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کہیں سے لنکن کے لہجے کے بارے میں مستند معلومات حاصل ہو جائیں۔ وہ لائبریری آف کانگریس گیا اور وہاں اس نے اس علاقے کے لوگوں کے لب و لہجے کی ریکارڈنگ سنی جہاں

لنکن نے بچپن گزارا تھا۔ اور پھر اس نے ہوبہو لنکن کے لہجے میں بولنا سیکھ لیا اور بڑی کامیاب اداکاری کی۔

ایک شخص کو شوق ہوا کہ وہ میامی کے ساحل کے پاس سمندر کے اندر جزیرے پر قدیم بحری کپتانوں جیسا لکڑی کا گھر بنائیں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ویسے گھروں کے بارے میں تفصیلی معلومات کہاں سے حاصل کی جائیں۔ انہوں نے لائبریری آف کانگریس کا رخ کیا اور وہاں سے اٹھارویں صدی کے ایک ایسے ہی گھر کے نقشے اور تصاویر حاصل کرلیں۔ امریکہ کی اس لائبریری کو علم کا کیپسول کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں دنیا بھر کی معلومات جمع ہیں۔ یہ امریکہ کی کانگریس یعنی پارلیمینٹ کی عمارت کے قریب ہی واقع ہے۔ کرہ ارض کی اس سب سے بڑی لائبریری میں اتنی کتابیں اور معلوماتی چیزیں رکھی گئی ہیں کہ اگر لائبریری کی سب الماریوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا جائے تو پانچ سو پنتیس (۵۳۵) میل لمبی دیوار بن جائے گی۔ جی ہاں! اس لائبریری میں آٹھ کروڑ پچاس لاکھ آئٹم ہیں جن میں سے صرف کتابوں کی تعداد دو کروڑ سے زائد ہے۔ جس قدر نقشے گلوب، ریکارڈنگز، فلمیں، نیوز ریلیں اور نجی و سرکاری دستاویزات یہاں موجود ہیں ساری دنیا میں کہیں بھی نہیں ہیں۔ اور ان کی رنگارنگی کا عالم یہ ہے کہ یہاں ایک طرف تو آپ کو دنیا کی سب سے پرانی فلم مل جائے گی اور دوسری طرف قدیم ترین چھپائی کے نمونے بھی۔ اور اگر چاہیں تو دنیا کی سب سے چھوٹی کتاب۔ چیونٹی سے بھی چھوٹی کتاب۔ بھی آپ یہاں دیکھ سکتے ہیں۔

ہر روز کوئی اکتیس ہزار نئی کتابیں، رسالے، ریکارڈ کی دیگر چیزیں اس لائبریری میں پہنچتی ہیں۔ مخیّر حضرات، مشنری اداروں اور مصنّفوں کی بھیجی ہوئی اشیاء اس کے علاوہ ہوتی ہیں۔

لائبریری آف کانگریس میں دنیا بھر کی معلومات ذخیرہ کی جاتی ہیں۔ یہاں دنیا کی چار سو ستر زبانوں میں لکھی گئی کتابیں محفوظ ہیں۔ ایک طرف یہاں دنیا کی سب سے بڑی عربی لائبریری ہے۔ تو دوسری طرف تبت کے متعلق اتنے نوادرات ہیں جتنے خود تبت میں بھی نہیں ہیں۔ مزے کی بات یہ کہ انقلاب سے پہلے کے روس کے متعلق جتنے فوٹوگراف یہاں موجود ہیں اتنے خود سوویت یونین میں بھی نہیں ہیں۔

اگر آپ لائبریری سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو اس کے لئے کسی خاص اجازت نامے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کوئی بھی علم کا پیاسا ہو علم کے اس بحر بیکراں کے ۲۳ میں سے کسی بھی کمرے میں بیٹھ کر اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔

آپ جب بھی اس لائبریری میں جائیں، آپ کو کوئی مصنف اپنے ناول کے لئے معلومات اکٹھی کرتا

مشیر احمد صدیقی۔ پروڈیوسر پی ٹی وی لائبریری کا دورہ کر رہے ہیں

مل جائے گا تو دوسرا کسی موسیقار کی بجائی ہوئی اصل دھن سے لطف اندوز ہوتا نظر آئے گا۔ کہیں کوئی فلمساز اپنی فلم کے کرداروں کے لئے انیسویں صدی کے فیشن کی تصویریں دیکھ رہا ہو گا۔ تو کوئی ریڈ انڈین قبیلوں کے پرانے رسم ورواج کا مطالعہ کر رہا ہو گا۔ اور اس میں کہیں کوئی بڑی بی اپنے خاندان کی تاریخ کا سراغ لگاتی ملیں گی۔

جب ۱۸۰۰ء میں امریکہ کی کانگریس کو فلاڈیلفیا سے واشنگٹن ڈی سی منتقل کیا گیا تو پانچ ہزار ڈالر کی کتابیں بھی خریدی گئیں تاکہ کانگریس کے قانون ساز ارکان کی ضروریات پوری کی جاسکیں۔ لیکن ۱۸۱۴ء میں برطانوی فوجیوں نے کیپٹل نامی اس عمارت کو آگ لگادی جس میں لائبریری قائم تھی۔ یوں پوری کی پوری لائبریری جل کر خاکستر ہو گئی۔

اس وقت سابق صدر تھامس جیفرسن نے اپنی ذاتی لائبریری کانگریس لائبریری کے لئے فروخت کر دی۔ اس میں ۲ ہزار ۷۸۶ کتابیں تھیں جو ۱۰ گاڑیوں پر لاد کر لائی گئیں۔

۱۸۵۱ء میں ایک مرتبہ پھر کیپٹل، میں آگ لگ گئی اور لائبریری کے ذخیرے کا دو تہائی حصہ تباہ ہو گیا جس میں زیادہ تر جیفرسن والی کتابیں تھیں۔

۱۸۵۱ء میں کانگریس نے ایک قانون منظور کیا جس میں ہر اس فرد کو جو کسی کتاب، چارٹ، نقشے، فوٹو گراف، چھپے ہوئے یا کھدے ہوئے کام یا موسیقی کی دھن کے حقوق محفوظ کرنا چاہتا ہو حکم دیا گیا کہ وہ لازمی طور پر اپنی چیز کی دو نقلیں لائبریری کو بھیجے۔

تھوڑے ہی عرصے میں کتابوں اور دیگر چیزوں کے انبار لگ گئے۔ اب کانگریس نے اس سیلاب کو ذخیرہ کرنے کے لئے یکے بعد دیگرے دو عمارتیں بنوائیں لیکن کتابوں اور دیگر چیزوں کا سیلاب تھا کہ اڈا چلا آتا تھا۔ حتیٰ کہ ۱۹۶۵ء تک اس میں بھی تل دھرنے کو جگہ نہیں بچی تھی۔ اور کتابیں رکھنے کی جگہ کا مسئلہ تھا چنانچہ نئی عمارت بننے تک ذخیرہ کرنے کے لئے شہر کے باہر کچھ گودام کرائے پر لینے پڑے۔

نئی عمارت ۱۹۸۰ء میں مکمل ہوئی۔ اس کا نام جیمس میڈیسن میموریل بلڈنگ ہے۔ یہ عمارت نہ صرف پچھلی دونوں عمارتوں کی مجموعی وسعت سے زیادہ وسیع ہے بلکہ کرہ ارض پر سب سے بڑی لائبریری کی عمارت بھی ہے۔

لائبریری کا عملہ تقریباً پانچ ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ یہ امریکی قوم کے نابینا اور ذہنی طور پر معذور افراد کے لئے مخصوص قسم کی ریکارڈنگز، ٹیپ اور بریل لٹریچر بھی تقسیم کرتا ہے اس سے استفادہ کرنے والے ایسے معذورین کی تعداد ۷ لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔

لائبریری کے نایاب کتب والے حصے میں ایک سے بڑھ کر ایک نادر کتاب موجود ہے۔ یہاں آپ کو گوٹن برگ کی بائبل بھی مل جائے گی۔ جو متحرک ٹائپ سے چھاپی جانے والی دنیا کی پہلی کتاب ہے۔ دوسری صدی عیسوی کے زمانے کی ہومر کی نظمیں بھی ملیں گی جو پاپائرس پر لکھی گئی تھیں۔ پاپائرس ایک خاص پودا تھا جو نیل کی وادی میں اگتا تھا اور اس زمانے میں لوگ اس پودے کے چوڑے پتے ہی لکھنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ کاغذ اس زمانے میں دستیاب نہیں تھا۔

لائبریری آف کانگریس کا ایک حصہ چھوٹی کتابوں کا ہے۔ اس میں آپ کو پندرہ سو سے زیادہ کتابوں کے ایسے چھوٹے ایڈیشن ملیں گے جن کی لمبائی ۴ انچ سے بھی کم ہے۔ ان میں پندرہویں صدی سے لے کر آج تک کی کتابیں شامل ہیں۔ سب سے عجیب و غریب کتاب وہ ہے جسے دنیا میں چھپنے والی سب سے چھوٹی کتاب قرار دیا جاتا ہے۔

اس کتاب کا نام اولڈ کنگ کول ہے۔ اسکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والی یہ کتاب ایک چیونٹی سے بھی چھوٹی ہے۔ اور اسے یا تو خوردبین سے پڑھا جاسکتا ہے یا پھر بڑا کر کے دکھانے والے کسی بہت ہی طاقتور عدسے کی مدد سے۔

یہاں پہلا ہوائی جہاز بنانے والے بھائیوں آرول اور ولبر رائٹ سے متعلق چیزوں کا ذخیرہ ہے۔ اس میں اس پہلی پرواز کی تاریخی تصویر بھی رکھی ہے۔ جو انہوں نے ۱۹۰۳ء میں شمالی کیلفورنیا میں کٹی ہاک کے مقام کے قریب کی تھی۔ ساتھ ہی وہ ٹیلی گرام بھی رکھا ہوا ہے جس میں انہوں نے اپنے والد کو اپنی کامیابی سے آگاہ کیا تھا۔

لائبریری میں چالیس لاکھ نقشے بھی ہیں۔ جن الماریوں میں یہ نقشے رکھے گئے ہیں ان کی کل گنجائش دو ایکڑ کے لگ بھگ ہے۔ آپ یہاں چاند اور سمندر کی تہوں سے لے کر دنیا کے چھوٹے بڑے شہروں تک کے نقشے دیکھ سکتے ہیں دوسرے شعبوں میں کوئی نوے لاکھ فوٹو گراف اور نیگٹو ہیں۔ لکڑی کی بنی ہوئی اور کھدی ہوئی چیزیں یا لیتھو گراف کے ایک لاکھ دس ہزار آئٹم ہیں اور ۷۵ ہزار پوسٹر ہیں۔

ایک حصے میں بہت ہی ماہر فوٹو گرافروں کی کھینچی ہوئی تصاویر کے مجموعے رکھے گئے ہیں۔ جن میں ۱۸۴۰ء کی دہائی کے زمانے کی کھینچی گئی تصاویر بھی شامل ہیں۔

یہ لائبریری دنیا بھر کے لوگوں کی عوامی زندگی کا ریکارڈ محفوظ کرنے کے لئے کوشاں رہتی ہے۔ یہاں ساری دنیا سے جمع کئے گئے تین لاکھ گانے، سنائی گئی کہانیاں اور دیسی آلات سے بجائے گئے ساز سینے محفوظ ہیں۔ ان میں سے بعض کو انمول قرار دیا گیا۔ ان میں سے زیادہ تر ریڈ انڈین قبیلوں کے گانے' رقص محفوظ ہیں۔

لائبریری آف کانگریس میں موجود کتابوں میں سے اوسطاً ۷۰ ہزار کتابیں ہر سال یا تو ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں یا برادہ بنتی چلی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کاغذ بنانے میں تیزاب بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے کاغذ ۲۵ سے سو سال کے عرصے میں خود بخود تباہ ہو جاتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ۱۵۰ سال یا اس سے پہلے کے زمانے میں چھاپی جانے والی کتابیں اور دستاویزات کے کاغذ پر وقت گزرنے کے ساتھ اس قسم کا کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ اسے بنانے میں تیزاب استعمال نہیں کیا گیا تھا۔

گزشتہ دس سالوں کی مسلسل تحقیق کے بعد لائبریری کے سائنس دانوں نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے جو کاغذ میں موجود تیزابیت کو ختم کر کے اسے زیادہ پائیدار بنا سکتا ہے۔ اس طریقے کے ۱۹۹۱ء تک مکمل طور پر قابل عمل ہونے کی امید ہے۔ اور جب اس طریقے پر عمل شروع ہو گیا تو نہ صرف لائبریری آف کانگریس بلکہ دنیا بھر کی لائبریریوں اور دستاویز گھروں کا بھی ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

لائبریری آف کانگریس کے ڈائریکٹر مسٹر جیمس ایچ بلنگٹن ہیں۔ ان کے خیال میں یہ لائبریری جہالت اور لاعلمی کو ختم کرنے اور علمی معیارات کو بلند کرنے کا ایک عظیم ذریعہ ہے ۔ وہ کہتے ہیں "یہ ادارہ کسی

فرد کا باقی پوری انسانیت کے حافظے، ذہن اور تصور سے رابطے کا کام کرتا ہے۔"

آنکھ مچولی کے پیارے ساتھیو! آپ نے دیکھا کہ علم کا یہ کیپسول سال دو سال کی نہیں بلکہ صدیوں کی مسلسل محنت کا نتیجہ ہے۔ اس میں موجود ساری اچھی اچھی معلومات ہماری ہی ہیں کیونکہ مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ حکمت و دانائی جہاں بھی ملے اپنی گم شدہ چیز سمجھ کر لے لو۔ آپ میں سے جسے بھی جب کبھی جتنا جتنا موقع ملے۔ اسے نہ صرف اس لائبریری اور دوسرے کتب خانوں سے علم حاصل کرنا چاہئے بلکہ کتابوں کی محبت اپنے دل میں بسانی چاہئے اور ایسے کتب خانوں کی بنیادیں رکھنی چاہیں جو آگے چل کر انشاء اللہ علم کے بڑے بڑے ذخیرے بن جائیں گے۔ (تصاویر بشکریہ مُشیر احمد صدیقی)

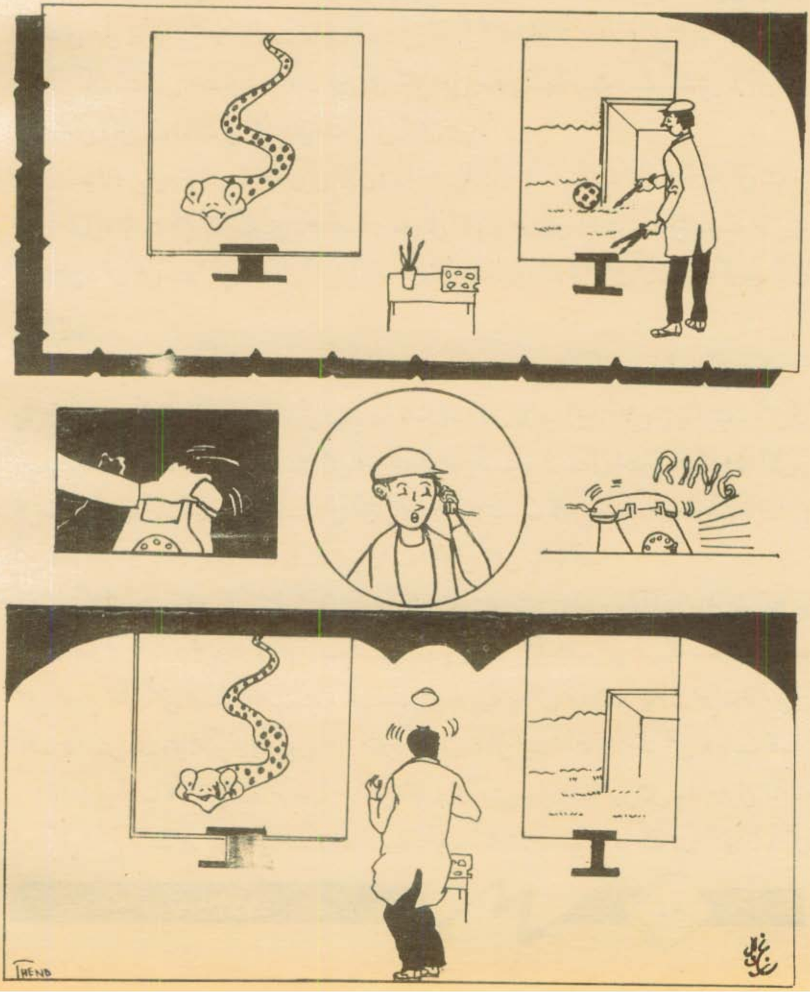

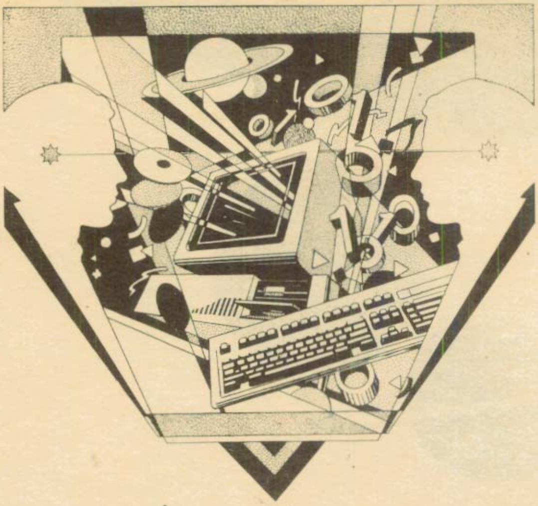

سائنس انکوائری

ایاز محمود

سوال ...... مریخ کی زمین کا رقبہ کتنا ہے اور اس کی مٹی کا رنگ کیسا ہے۔ ؟

اکبر حسن بھٹی.....وہاڑی

آپ نے غالباً مریخ کا قطر پوچھا ہے۔ مریخ کا قطر زمین کے نصف قطر سے کچھ زیادہ ہے یعنی ۴۲۰۰ میل۔ جب کہ زمین کا قطر تقریباً آٹھ ہزار میل ہے۔ آپ نے اس کی مٹی کی رنگت کے بارے میں پوچھا ہے تو بھائی یہ ایک بہت دلچسپ چیز ہے اور اس کے بعض حصّوں کا رنگ موسم کی مناسبت سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ زمین سے یہ حصے دھبوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ یہ دھبے نیلے سبز اور کتھئی رنگوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ پہلے خیال کیا گیا کہ یہ نباتات کی ایک قسم ہیں جو موسمی کیفیات کے تحت رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ بعد میں اسے سرابِ نظر سے تعبیر کیا گیا۔

مریخ ہمارے نظام شمسی کے ان سیاروں میں سے ہے جن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی جستجو رہی ہے۔ ایک زمانے میں تو یہ خیال زور پکڑ گیا تھا کہ مریخ پر بھی انسان نما مخلوق پائی جاتی ہے۔ مشہور ناول نویس ایچ جی ویلز کا ڈرامہ "مریخ کا حملہ" جب ریڈیو پر نشر کیا گیا تو لوگ اسے سچ سمجھ بیٹھے اور حقیقتاً افراتفری اور بھگدڑ کا سماں پیدا ہوگیا۔ یہ بات آج سے تقریباً ۵۲ سال پرانی ہے۔

اب سے کچھ عرصہ پہلے تک سائنسی سطح پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ مریخ پر نہریں موجود ہیں۔ اس بات کا اعلان ایک اطالوی ماہرِ فلکیات شیاپریلی نے کیا تھا۔ بعد میں اس نظریہ کو بھی فریب نظر کہہ کر مسترد کر دیا گیا۔ جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق تاحال مریخ پر زندگی کے آثار کے واضح ثبوت نہیں

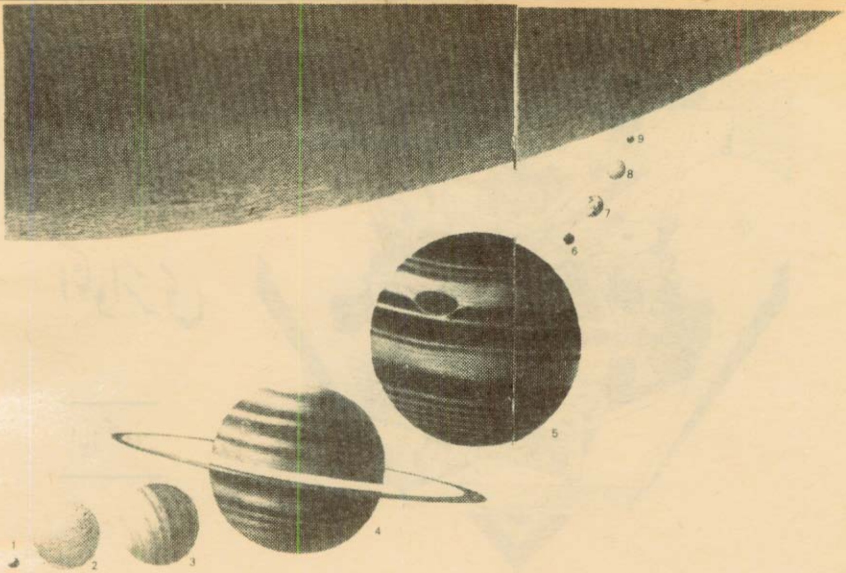

مل سکے ہیں۔

سوال...... اب تک کتنے سیارے تلاش کئے جا چکے ہیں؟

عمر خطاب خان صنم...... اورنگی ٹاؤن...... کراچی

سولر سسٹم یا نظام شمسی، سورج اور اس کے زیر کشش نو سیاروں پر مشتمل ہے۔ یہ سیارے جن کے نام عطارد، زہرہ، زمین، مریخ، مشتری، زحل، یورے نس، نیپچون اور پلوٹو ہیں مسلسل اپنے مدار میں موجود رہتے ہوئے سورج کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ مدار بالکل گول نہیں بلکہ بیضوی ہے۔ اس طرح ان سیاروں کا سورج سے فاصلہ کم وبیش ہوتا رہتا ہے۔

ہماری زمین بھی ایک سیارہ ہے جو کہ اوسطاً سورج سے ۹۳۶۰۰۰ میل دوری پر واقع ہے۔ زمین بھی سورج کے گرد اپنے مدار میں محو سفر ہے۔ اس کا ایک چکر ۳۶۵ دنوں میں پورا ہوتا ہے۔ جو کہ ہمارے کیلنڈر کے حساب سے ایک سال کا عرصہ بنتا ہے۔

آپ یقیناً یہ بھی جاننا چاہیں گے کہ وہ کون سی طاقت ہے جو تمام سیاروں کو نہایت درستگی کے ساتھ اپنے مدار میں رکھتی ہے۔ اس بات کو سمجھے کے لئے آپ کو دو اصطلاحوں مرکز گریز قوت اور قوت تجاذب کو سمجھنا ہوگا۔ اس کو سمجھنے کے لئے ایک چھوٹا سے کھیل کھیلئے۔ ایک ڈھیلے کو کسی ستلی وغیرہ سے باندھ کر سر کے اوپر زور سے گھمایئے۔ ڈھیلا ایک دائرہ کی صورت میں ایک خاص مدار میں گھومنے لگے گا۔ اس عمل سے ستلی میں تناؤ پیدا ہوجائے گا اور اس تناؤ کو آپ اپنی انگلی میں بھی محسوس کر سکیں گے۔ اب ذرا ستلی کو ہاتھ سے چھوڑ دیجئے ڈھیلا اپنے ہی زور میں دور جاکے گرے

گا۔ یہی طاقت مرکز گریز قوت (Centrifugal Force) ہے۔ تجاذب کیا ہے؟ تجاذب وہ قوت ہے جس کے تحت ہر مادی شے دوسری شے کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ تو بھئی سورج اور اس کے سیاروں کے درمیان یہی دو قوتیں کام کر رہی ہیں۔

مرکز گریز قوت سے سیارے اپنے مدار سے نکلنا چاہتے ہیں لیکن سورج کی قوت تجاذب یا کشش انہیں ایسا کرنے سے باز رکھتی ہے۔ لہٰذا سیارے ایسے مقام پر ہوتے ہیں جہاں مرکز گریز قوت اور تجاذب کے اثرات برابر ہوجاتے ہیں۔ سیارہ اپنے مدار سے باہر اس لئے نہیں نکل سکتا کہ سورج اسے کھینچ رہا ہے اور تجاذب کے زیر اثر سورج سے جا کر ٹکرا نہیں جاتا کہ مرکز گریز قوت بھی برابر عمل پزیر ہے۔ اب سیارہ کرے تو کیا کرے۔ بس وہیں معلق ہو کر چکر پہ چکر لگاتا رہتا ہے۔

سوال ...... ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم سے کیا مراد ہے؟
خورشید احمد بھٹو ...... کوٹ منزل ...... رحیم یار خان

ہمارا برتاؤ اور معمولات بہت حد تک شعور کے تابع ہوتے ہیں۔ شعوری کوشش کے تحت ہم جو عمل کرتے ہیں اس میں ہماری منصوبہ بندی اور ارادے کا دخل ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف بہت سارے اعمال ہم سے لاشعوری طور پر سرزد ہوتے ہیں۔ وہ ہماری خصلت میں شامل ہو کر شخصیت کا اس طرح حصہ بن جاتے ہیں کہ ان کو کرنے یا نہ کرنے پر ہمارا اختیار بہت کم ہوتا ہے۔ ڈر، خوف، شک، مایوسی، گھبراہٹ اور وہم وغیرہ وہ احساسات ہیں جن کا تعلق انسانی لاشعور سے ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ شعور کو لاشعور پر زیادہ سے زیادہ حاوی رکھیں۔

ہپناٹزم کا ماہر (جو ایک ماہر نفسیات ہوتا ہے) ایک خاص طریقہ سے اپنے معمول (وہ شخص جس پر ہپناٹزم کا عمل کیا جائے) کے شعور کو وقتی طور پر سُلا دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ مختلف سوالات کے ذریعے لاشعور میں چھپی ہوئی باتوں کا سراغ لگاتا ہے اور پھر مختلف ہدایات و ترغیبات کے ذریعے سے خرابیوں اور کمزریوں کا سدّباب کرتا ہے۔ ماہرِ نفسیات اپنے مقصد کے حصُول کے بعد ایک ہدایت کے ذریعے معمول کو پھر سے شعوری دنیا میں لے آتا ہے۔ اس سارے تجربہ کے دروان معمول عامل کے تابع ہوتا ہے۔ یہ طریقہ علاج دماغی یا نفسیاتی مرائض میں مبتلا اشخاص کے لئے کار آمد پایا گیا ہے تاہم دورِ حاضر میں یہ کچھ زیادہ مقبول نہیں بلکہ اس کی جگہ ایک اور طریقہ علاج (Psychoanalysis) زیادہ مفید ثابت ہوا ہے۔

پرانے زمانے میں جب مریضوں کو بے ہوش کرنے والی دوائیں ایجاد نہیں ہوئی تھیں ہپناٹزم کے ذریعے مریض کو ترغیب دی جاتی تھی کہ اس کا جسم سن ہوگیا ہے۔ اس کے بعد متعلقہ حصے کا آپریشن کر لیا جاتا اور اس دوران مریض کو تکلیف کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

بہت سے لوگ ہپناٹزم کو شعبدہ بازی، جادو یا

کھیل تماشے سے زیادہ نہیں سمجھتے،لیکن یہ ایک باقاعدہ علم ہے جس کی بنیادیں سائنسی اصولوں پر استوار ہیں۔ محض سنسنی خیزی یا تفریح کے لئے اس کی مشق کرنا نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

سوال ...... کاسمک ریز کسے کہتے ہیں۔ یہ کس نے دریافت کی؟

راشد اشرف اعوان...... واپڈا کالونی...... حیدر آباد

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ کاسمک ریز ہیں کیا...... کاسمک ریز کو ہم کائناتی شعائیں بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور وہ اس لئے کہ یہ زمین یا اس کے اطراف میں پیدا نہیں ہوتیں بلکہ بہت دور خلائے بسیط سے آتی ہیں۔

آپ نے برقی مقناطیسی (Electromeg-natic) شعاعوں کا ذکر سنا ہو گا۔ مثلاً سفید روشنی کی شعاعیں جو دراصل سات رنگوں کا مجموعہ ہیں۔ بالا شعاعیں (X—Rays) جو عام طور پر طبّی تشخیص میں کام آتی ہیں۔ بالا بنفشی شعاعیں (Ultra violet rays) اور زیریں سرخ (Inf-ara Red) شعاعیں۔ اس کے علاوہ ہم آپ کو ریڈیائی موجوں کے بارے میں بھی بتا چکے ہیں جن کی مدد سے ہم ریڈیو اور ٹی وی کے پروگرامات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ سب برقی مقناطیسی شعاعیں ہیں جن کی حد رفتار روشنی کی رفتار ہے۔ یعنی ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ۔

کائناتی شعاعیں ایک نظریہ کے مطابق بہت دور کائنات میں پائے جانے والے ستاروں کے درمیان گیس کے بادلوں کے مقناطیسی اثرات سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ صحیح معنوں میں شعاعیں بھی نہیں بلکہ ذرات کا مجموعہ ہیں جن پر برقی بار ہوتا ہے۔ معمولی قوت کے حامل ذرے جب خلا میں موجود گیس کے بادلوں کے پاس سے گزرتے ہیں تو ان میں بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ ذرے کسی دوسرے بادل کے پاس سے گزرتے ہیں تو ان کی قوت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح یہ قوت بڑھتی جاتی ہے۔ یہ بے پناہ قوت کے حامل ذرات ہیں۔ سورج کی اندرونی سطح میں پائے جانے والے ذرات بھی ان کے سامنے کچھ نہیں اور طاقت میں ان سے کروڑوں گنا کم ہیں۔

ہماری زمین کے اوپر پایا جانے والا فضائی غلاف ہمیں کائناتی شعاعوں کی یلغار سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور ایک طرح سے ہمارے لئے ڈھال کا کام کرتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو بہت تباہی پھیلے اور حیات انسانی خطرے میں پڑ جائے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اگر ہم نے اپنی فضائی کثافتوں اور آلودگیوں پر قابو نہ پایا تو کچھ عرصے بعد ہمارے چاروں طرف تنے ہوئے فضائی کرے میں ایسے چھید ہو جائیں گے جو کائناتی اور دیگر مہلک شعاعوں کے لئے کھڑکی کا کام کریں گے۔ اس نتیجے میں جو تباہی پھیلے گی اس کا تصور بھی محال ہے۔

کائناتی شعاعوں کو پہلی بار ۱۹۰۰ء میں پروفیسر سی۔ ٹی۔ آر۔ ولسن نے دریافت کیا۔اس کی کہانی بھی دلچسپ ہے جو پھر کبھی سنائیں گے۔

ظلم کا انجام

امان اللہ نیرؔ شوکت

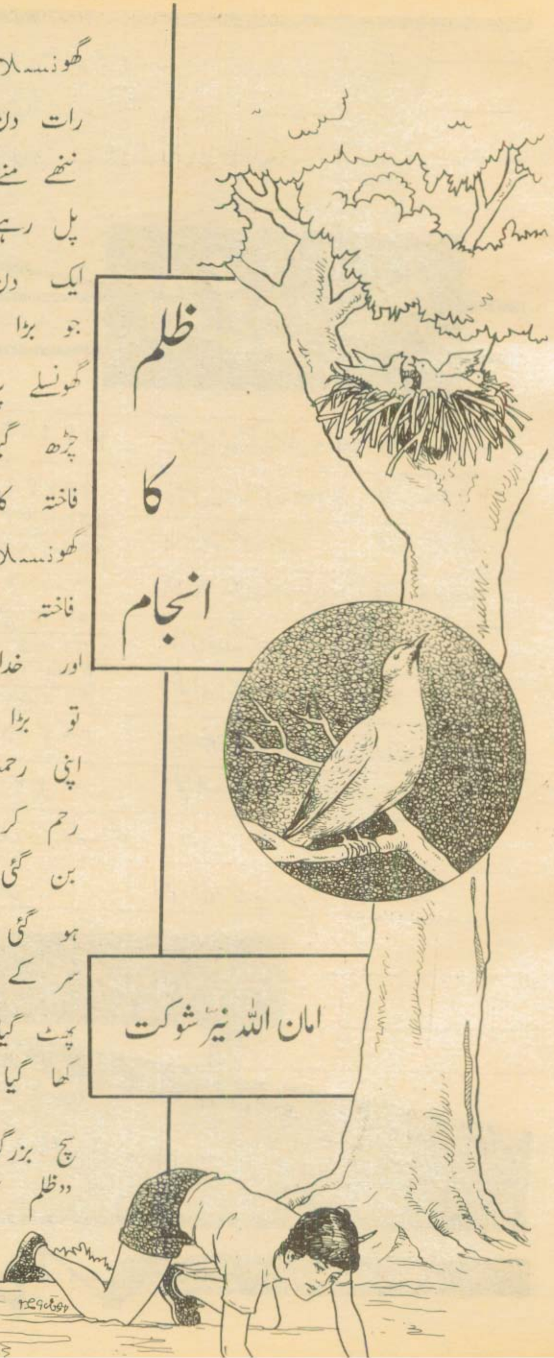

گھونسلا ایک فاختہ کا تھا کہیں
رات دن رہتی تھی وہ بچو! وہیں
ننھے منے اس کے کچھ بچے بھی تھے
پل رہے تھے جو وہاں آرام سے
ایک دن لڑکا وہاں اک آگیا
جو بڑا ظالم شریر اور شوخ تھا
گھونسلے پر جب پڑی اس کی نظر
چڑھ گیا فوراً وہ لڑکا پیڑ پر
فاختہ کا دل دکھانے کے لئے
گھونسلا اس کا گرانے کے لئے
فاختہ یہ دیکھ کر گبھرا گئی
اور خدا سے التجا کرنے لگی
تو بڑا غفار ہے اچھے خدا
اپنی رحمت سے میرے بچے بچا
رحم کر مجھ ناتواں پر رحم کر
بن گئی ہے دیکھ میری جان پر
ہو گئی منظور اس کی یہ دعا
سر کے بل لڑکا زمیں پر گر پڑا
پھٹ گیا اس شوخ اور ظالم کا سر
کھا گیا غش خون بہتا دیکھ کر

سچ بزرگوں نے ہے اے نیر کہا
"ظلم کا انجام" ہوتا ہے برا

علم وادب کے فروغ میں جو ادارے "آنکھ مچولی" سے تعاون کر رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں، جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

آنکھ مچولی کے ایجنٹس

پاکستان بھر میں

محمد حسین برادرز۔ کراچی فون: ۲۳۹۵۵

سلطان نیوز ایجنسی۔ لاہور فون: ۵۸۲۴۹

ملک تاج محمد صاحب۔ راولپنڈی فون: ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶

مہران نیوز ایجنسی۔ حیدر آباد فون: ۲۰۱۲۸

افضل نیوز ایجنسی، چوک یادگار، پشاور فون: ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱

اے ایس حامد نیوز پیپر سروس، ملتان فون: ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷

فیاض بُک ڈپو۔ فیصل آباد فون: ۲۷۴۰۶

سعید بُک اسٹال۔ گجرات فون: ۴۳۳۱

سلمان برادرز۔ نواب شاہ فون: ۲۴۱۴

یونائیٹڈ بک لینڈ۔ سکھر

پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال۔ سرگودھا فون: ۶۲۹۵۱

کیپٹل نیوز ایجنسی۔ بہاولپور فون: ۲۹۵۷

طاہر نیوز ایجنسی۔ جہلم فون: ۵۹۴۱

چوہدری امانت علی اینڈ سنز۔ رحیم یار خان فون: ۲۶۲۶

وہاڑی نیوز ایجنسی۔ ریل بازار وہاڑی

اسلم نیوز ایجنسی۔ اخبار گھر۔ گوجرانوالہ

اشرف نیوز ایجنسی۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ۔ اوکاڑہ

مسلم بُک ڈپو۔ سرائے عالمگیر

ایم۔ ایم ٹریڈرز۔ کوئٹہ

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھئے

سرکولیشن منیجر
"ماہنامہ آنکھ مچولی" ڈی ۱۱۲، نورس روڈ، سائٹ کراچی ۱۶

بُری بات

منیراحمد راشد

بھوک سے اس کا بُرا حال تھا۔ گزشتہ دو دن کی طرح آج بھی وہ صبح سے مارا مارا پھر رہا تھا۔ لیکن لگتا تھا کہ رزق اس سے روٹھ گیا ہے۔ یا شاید اس کے مقدّر میں اتنا ہی رزق تھا جتنا وہ اپنی دس برس کی عمر میں کھا چکا تھا۔ دن میں صرف ایک بار۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوا تھا کہ اسے دو وقت پیٹ بھر کے کھانا نصیب ہوا ہو۔ بھوک تو اس کی جنم جنم کی ساتھی تھی۔ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کے گھر میں در آئی تھی۔ ایک ماہ کا تھا کہ باپ چل بسا۔ بھائی کو ہیروئن کے نشے نے ڈس لیا تھا۔ ماں اس کے غم میں رو رو کر آدھی ہو گئی تھی۔ کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا۔ محلے پڑوس کے گھروں میں جھاڑو برتن کرتی تو کچھ بچا کھچا کھانے کو مل جاتا۔ اور کبھی کوئی ترس کھا کر اپنی اُترن دے دیتا تو بدن ڈھک

جاتا۔ دن یونہی گزرتے گئے یہاں تک کہ دس سال کا عرصہ بیت گیا۔

اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ جب یونیفارم میں ملبوس ننھے منے بچوں کو اسکول جاتے دیکھتا تو اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی اسی طرح بن ٹھن کر اسکول جایا کرے۔ ہنستا کھیلتا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ اچھی اچھی نظمیں یاد کرے۔ اکثر خوابوں میں خود کو اسکول کے اندر پاتا۔ کبھی دیکھتا کہ دوستوں کے ساتھ خوب دل لگا کر سبق یاد کر رہا ہے۔ کبھی کرکٹ کھیلتا اور کبھی اسکول کے باہر موجود آئس کریم کی دکان پر کھڑا ٹھنڈی ٹھنڈی مزیدار آئس کریم کھا رہا ہوتا۔

گزشتہ چند روز سے اس کی یہ خواہش بہت شدید ہو گئی تھی۔ اسکولوں میں داخلے شروع ہو چکے تھے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ دو ایک سرکاری اسکولوں میں گیا۔ مگر داخلہ نہ مل سکا۔ اسکول والوں کا مطالبہ تھا کہ پہلے وہ گھر پر کچھ لکھنا پڑھنا سیکھے۔ کچھ الف، بے یاد کرے۔ ۱۰۰ تک گنتی نہ صرف زبانی یاد ہو بلکہ لکھنا بھی آتی ہو وغیرہ...... اسکول کے باہر ہی ایک عورت نے جو اپنے بچے کو داخل کروانے آئی تھی انہیں بتایا تھا کہ کسی "بڑے صاحب" کی "پرچی" سے کام چل سکتا ہے۔ مگر وہ تو کسی بڑے صاحب کو جانتے بھی نہ تھے۔

محلے ہی میں ایک خوب صورت سا پرائیویٹ اسکول تھا۔ اس نے ماں سے کہا کہ اسے یہاں داخل کروا دے۔ لیکن فیس کا مسئلہ آڑے آیا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر فاضل صاحب تھے۔ اصول کے بڑے پابند انسان ہیں۔ بغیر فیس کے کسی کو نہیں پڑھاتے تھے۔ پھر بھی وہ خود ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ انہیں اپنے سارے حالات بھی بتائے۔ فاضل صاحب نے کمال مہربانی کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے! ہم تمہیں داخلہ فیس معاف کر دیں گے لیکن پچاس روپے ماہانہ ٹیوشن فیس تو ضرور ادا کرنی پڑے گی۔ اور وہ بھی ایڈوانس۔ ایک ہفتے کے اندر اندر۔ کیونکہ اس کے بعد داخلے بند ہو جائیں گے"

وہ اسکول سے نکل آیا۔ "۵۰ روپے" اس کے ذہن میں ہیڈ ماسٹر صاحب کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے کبھی اپنے گھر میں پچاس کا نوٹ نہیں دیکھا تھا۔ ماں کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے کہا۔

"رہنے دو بیٹا! یہ پڑھنا لکھنا امیروں کے چونچلے ہیں۔ ہم غریبوں کا پڑھائی پر کوئی حق نہیں۔" لیکن وہ اتنی جلدی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح فیس کے پیسے

جمع ہو جائیں مگر جب پیٹ خالی ہو تو اسے بھرنے کی خواہش باقی تمام خواہشات پر غالب آجاتی ہے۔ اور اسے تو کبھی پیٹ بھر کھانا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ تعلیم تو دور کی بات تھی۔

جب اس نے ماں سے دوبارہ ضد کی تو اس نے کہا۔

" دیکھ میرے چاند، ہمارے حالات ایسے نہیں ہیں کہ تو پڑھ سکے۔ میں دن بھر ہڈیاں گھلاتی ہوں تو تیرا اور اپنا پیٹ نہیں بھر سکتی۔ بتا! تیری کتابوں اور فیسوں کے پیسے کہاں سے لاؤں گی؟ بات سچی تھی۔ وہ سمجھ دار بچّہ تھا۔ گھر کے تمام حالات اس کے سامنے تھے۔ لیکن اسکول میں داخلہ لینے کا جنون کسی طرح کم نہ ہوا۔ اس نے سوچا کہ وہ خود محنت مزدوری کرے گا اور اتنے پیسے اکٹھے کر لے گا کہ کتابوں اور فیس کا خرچہ نکل سکے۔ اپنے اسی عزم کی تکمیل کے لئے اس وقت وہ گلشن اقبال کے ایک نسبتاً غیر آباد علاقے میں کھڑا تھا۔ یہاں زیادہ تر عمارتیں ابھی زیر تعمیر تھیں۔ اونچی اونچی خوب صورت عمارتوں کو تعمیر کا حسن بخشنے والے غریب مزدوروں کی عارضی جھونپڑیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ امارت اور غربت کا عجیب امتزاج تھا۔ سڑک کے ایک طرف ایک خوب صورت ریسٹورنٹ تھا اور اس کے عین مقابل سڑک کے دوسری طرف ایک جھونپڑا نما ہوٹل تھا۔ جہاں مزدور اور اسی قماش کے دوسرے لوگ اپنے پیٹ کا جہنم بھرتے تھے اور بے تحاشا مصالحے اور چربی سے تیار شدہ کھانوں کی صورت میں بے شمار لاعلاج بیماریاں اپنے اندر منتقل کرتے رہتے تھے۔ انس نے سوچا ایک بار پھر اس ہوٹل والے سے کام وغیرہ کا پتہ کرے تاکہ کچھ تو بھوک کا سدباب ہو سکے۔ لیکن جب ہوٹل کے مالک کا درشت رویہ یاد آتا تو اس کی ہمت جواب دے جاتی۔ کوئی اسے کام دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کی کم عمری اور نحیف بدن رزق کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اسے یاد تھا کہ کل جب ایک ٹھیکیدار سے اس نے مزدوری کے لئے درخواست کی تھی تو ٹھیکیدار نے اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا تھا۔ " ابے چل بھاگ، آیا مزدوری کرنے۔ سیمنٹ کی بوری کے نیچے دب گیا تو نکلنا مشکل ہو جائے گا"۔

ایک یہی کیا، وہ جہاں بھی گیا تقریباً ایسا ہی جواب ملا۔ ہوٹل کے مالک نے تو اسے چور اُچکّا بھی کہا تھا۔ اور دھکے دینے کے ساتھ ساتھ یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ جیب کترا بن جائے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ لیکن ماں تو کہتی تھی کہ کہ جیب کاٹنا بہت بُری بات ہوتی ہے۔ چوری کرنا اور جھوٹ بولنا بھی بُری بات ہے اور سب سے بُری بات تو یہ ہے کہ آدمی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ بھیک مانگنے سے بہتر ہے کہ انسان بھوکا رہے۔ اور وہ دو دن سے بھوکا تھا۔ ماں کی طبیعت خراب تھی۔ وہ کام پر نہ جا

سکی تھی۔ اس لئے وہ بھی بھوکی تھی۔

وہ کل سے سبزی منڈی اور ایسے ہی دوسرے علاقوں میں دھکے کھاتا پھر رہا تھا تا کہ مزدوری تلاش کر سکے اور ماں کے لئے دوا اور کھانا لے جاسکے۔ لیکن اسے ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ کل رات جب وہ ناکام اور نامراد لوٹا تو اس کا جسم تھکن سے چور تھا۔ اور گھر میں سوائے ماں کی دعاؤں کے اور کوئی شے ایسی نہ تھی جو اس کے درد کا درماں بنتی۔ دونوں صبر شکر کر کے لیٹ گئے تھے۔ ماں تو بیماری کے باعث اور وہ ماں کی کراہوں کے سبب سو نہ سکا تھا۔ آج صبح پھر ایک نئے عزم اور جواں حوصلے کے ساتھ وہ کام کی تلاش میں نکلا تھا۔ اور اس وقت دوپہر کے دو بجنے والے تھے۔ لیکن وہ مایوس نہیں تھا۔ نجانے کیوں اسے یقین سا تھا کہ اسے روزی جائز ذریعے سے ہی ملے گی۔

"اے لڑکے! یہ گیند پھینکنا۔ ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے سڑک کے دوسری طرف دو چھوٹے چھوٹے لڑکے اسکول کی وردی پہنے اور کندھوں سے اپنے بستے لٹکائے کھڑے تھے۔ ایک لڑکا ہاتھ کے اشارے سے وہ گیند واپس پھینکنے کے لئے کہہ رہا تھا جو شاید کھیلتے کھیلتے اِدھر آ گئی تھی۔ اس نے گیند اٹھائی اور ان کی طرف اُچھال دی۔ دونوں لڑکے کھیلتے ہوئے اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔ وہ حسرت سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسکول میں داخل ہونے کی خواہش ایک مرتبہ پھر شدت اختیار کر گئی تھی۔ بہت ہمت کر کے وہ اٹھا اور ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ اب زیادہ رش نہیں تھا۔ اِکا دُکا لوگ بیٹھے کھانے کے بعد گپیں ہانک رہے تھے اور سگریٹ پھونک رہے تھے۔ ابھی وہ ہوٹل کے باہر پڑی ہوئی میلی اور ڈھیلی چارپائیوں کے قریب ہی پہنچا تھا کہ ایک جانب سے بہت ہی میلے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس اسی کا ہم عمر لڑکا کمر پر بڑا سا تھیلا لادے وہاں آیا۔ تھیلے میں پرانے کاغذ اور استعمال شدہ شاپنگ بیگ بھرے ہوئے تھے۔ اس نے تھیلا زمین پر رکھا ایک طرف رکھی ہوئی پرانی سی ٹنکی سے ہاتھ دھوئے اور چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کھانے کا آرڈر دے دیا۔ وہ کچھ سوچ کر ہوٹل کے مالک کی طرف جانے کی بجائے اس لڑکے کی جانب بڑھ گیا۔ اور قریب پہنچتے ہی سوال کیا۔

"کیا میں بھی تمہارے ساتھ یہ کام کر سکتا ہوں؟" پہلے تو وہ لڑکا چونکا۔ پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ہاں! کیوں نہیں"۔

"تو ٹھیک ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا"

"کہاں چلو گے؟"۔

"کاغذ چننے کے لئے" اس نے سادہ سا جواب دیا۔ اور پھر ذرا سی دیر میں وہ دونوں بے تکلف دوست بن گئے۔ لڑکے کا نام گل جان تھا۔ گُل جان نے نہ صرف اسے کھانا کھلایا بلکہ اپنے کام کے ضروری طریقے اور فائدے بھی بتائے۔ اس نے بتایا کہ وہ دن بھر جو کاغذ وغیرہ اکٹھے کرتا ہے اس کے اُسے شام کو ساٹھ ستّر روپے مل جاتے ہیں...... ستّر روپے کا نام سن کر اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ آج خوب محنت سے کام کرے تو شام تک وہ بھی ستّر روپے کما لے گا۔ ماں کی دوا بھی آجائے گی اور فیس بھی ادا ہو جائے گی۔ ویسے بھی کل داخلے کی آخری تاریخ تھی۔

کھانے کے دوران میں بھی وہ اپنے اسکول والے خواب دیکھتا رہا۔ وہ بہت خوش تھا کہ کل اسے داخلہ مل جائے گا۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو جائے گی۔ کھانے کے بعد دونوں وہاں سے اٹھے اور قریب ہی واقع کچرے کے ایک بڑے ڈھیر کی طرف بڑھ گئے۔ یہاں کافی تعداد میں کاغذ وغیرہ پڑے تھے۔ گل جان نے اسے وہاں چھوڑتے ہوئے "کہا تم ادھر کام کرو۔ میں اگلے ڈھیر میں تلاش کرتا ہوں" اور وہ ذرا فاصلے پر موجود دوسرے ڈھیر کی جانب چلا گیا۔

ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک اور لڑکا اسی طرح کا تھیلا اٹھائے ہوئے وہاں آیا۔ عمر میں ذرا بڑا تھا اور شکل اور حلیئے ہی سے ہیروئن کا عادی دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کافی دیر سے پینے کو نہیں ملی تھی۔ اس سے ٹھیک سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ آتے ہی آنکھیں دِکھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم ادھر نیا لگتا ہے ! ہے ناں ؟"

اسے ہیروئن پینے والوں سے سخت نفرت تھی۔ اس کا بڑا بھائی بھی اس کا عادی تھا۔ نجانے اب کہاں ہو گا۔ ماں نے اس کے غم میں رو رو کر اپنی جان کو روگ لگا لیا تھا۔ وہ اپنی ماں سے بہت پیار کرتا تھا اسے روتا ہوا دیکھتا تو خود بھی رونے لگتا۔ ماں کو تسلیاں دیتا لیکن خود اپنے اندر وہ ہیروئن اور ہیروئن پینے والوں کے خلاف ایک زہریلی نفرت کو پال رہا تھا۔ جب نووارد نے اس سے بات کی تو اسے غصہ آگیا۔ کہنے لگا "ہاں نیا ہوں ، پھر؟

"اوئے بلبل ! لال پیلا نہیں ہو۔ تجھے پتہ نہیں یہ میرا علاقہ ہے" نووارد نے اس کی ٹھوڑی کو پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کوئی کسی کا علاقہ نہیں ہے۔ تم اگلے ڈھیر پر چلے جاؤ" اس نے اس غنڈہ ٹائپ لڑکے کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

"تُو چلا جا، وہ اُدھر" غنڈے نے دور ایک چھوٹے سے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سب کاغذ چھین لئے۔

"میں تو نہیں جاؤں گا۔ تم چلے جاؤ" وہ بھی اڑ گیا تھا۔

"نہیں جائے گا تو بہت ماروں گا" غنڈے کو بھی غصہ آ گیا تھا "ایک تو صبح سے پینے کو نہیں ملی، دوسرے تو......" اس نے غلیظ سی گالی بکتے ہوئے اسے دھکا دے کر پیچھے گرا دیا...... نشہ نہ ملنے سے اس کی بُری حالت ہو رہی تھی۔ اس کا تھیلا کافی بھرا ہوا تھا۔ لیکن شاید "پڑیا" کی قیمت سے کم تھا، اور وہ چاہتا تھا کہ جلدی سے رقم پوری ہو تو اس کا کام چلے۔ اس کا نشہ بُری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ لیکن ادھر حصول تعلیم کا حسین خواب ٹوٹ رہا تھا اور اگر شام تک دوا اور کھانا نہ ملتا تو ممکن تھا کہ اس کی ماں کا زندگی سے ناتا بھی ٹوٹ جاتا۔ وہ زمین سے اٹھا، غصہ سے نوارد کو دیکھا جو جلدی جلدی اپنے تھیلے کو کاغذوں سے بھر رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس سے کاغذ نہیں بلکہ اس کی پیاری ماں کی زندگی اور اس کے اپنے حسین خواب کسی نے چھین لئے ہوں۔ وہ رو پڑا اور چیختے ہوئے اس نووارد پر ٹوٹ پڑا جیسے اسے جان سے مار ڈالے گا۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ گل جان بھی اس کی مدد کے لئے آ گیا تھا۔ ممکن ہے یہ لڑائی کچھ دیر مزید جاری رہتی کہ ایک آواز نے انہیں چونکا دیا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

"لاحول ولا قوۃ، او کم بختو! کچرے کے لئے لڑ رہے ہو، ذرا سی عمر میں دولت کی اتنی ہوس ہو گئی۔ کچھ پڑھ لکھ لیا ہوتا تو انسان بن جاتے"

یہ فاضل صاحب تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر۔ جو اپنی گاڑی میں بیٹھے انہیں ڈانٹ رہے تھے۔

رستہ تلاش کریں

●● فرق بتائیں ●●

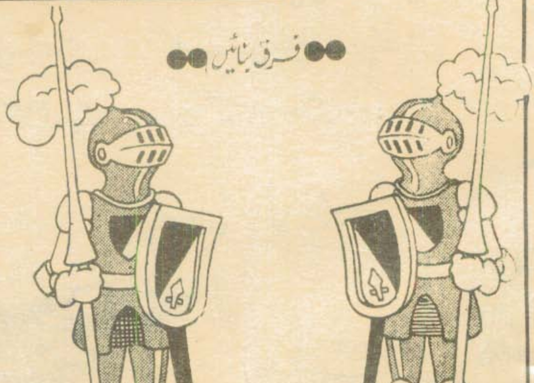

مرسلہ -
کاشف طاہر
واصف طاہر
ریاض سعودیہ

ایک گائے اور بکری

علامہ اقبالؒ

بچّوں کے لیے

اک چراگاہ ہری بھری تھی کہیں
تھی سراپا بہار جس کی زمیں
کیا سماں اس بہار کا ہو بیاں
ہر طرف صاف ندّیاں تھیں رواں
تھے اناروں کے بے شمار درخت
اور پیپل کے سایہ دار درخت
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں
طائروں کی صدائیں آتی تھیں
کسی ندّی کے پاس اک بکری
چرتے چرتے کہیں سے آ نکلی
جب ٹھہر کر اِدھر اُدھر دیکھا
پاس اک گائے کو کھڑے پایا
پہلے جُھک کر اسے سلام کیا
پھر سلیقے سے یوں کلام کیا
کیوں بڑی بی! مزاج کیسے ہیں!
گائے بولی کہ خیر اچھّے ہیں
کٹ رہی ہے بُری بھلی اپنی
ہے مصیبت میں زندگی اپنی

جان پر آبنی ہے، کیا کہیے! — اپنی قسمت بُری ہے، کیا کہیے
دیکھتی ہوں خدا کی شان کو میں — رو رہی ہوں بُروں کی جان کو میں
زور چلتا نہیں غریبوں کا — پیش آیا لکھا نصیبوں کا
آدمی سے کوئی بھلا نہ کرے — اس سے پالا پڑے، خدا نہ کرے!
دودھ کم دوں تو بُڑبُڑاتا ہے — ہوں جو دُبلی، تو بیچ کھاتا ہے
ہتھکنڈوں سے غلام کرتا ہے! — کن فریبوں سے رام کرتا ہے!
اس کے بچوں کو پالتی ہوں میں — دودھ سے جان ڈالتی ہوں میں
بدلے نیکی کے یہ بُرائی ہے — میرے اللہ! تری دُہائی ہے!!
سُن کے بکری یہ ماجرا سارا — بولی، ایسا گِلہ نہیں اچھا
بات سچی ہے بے مزا لگتی — میں کہوں گی مگر خُدا لگتی
یہ چراگہ، یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا — یہ ہری گھاس اور یہ سایا
ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں! — یہ کہاں، بے زباں غریب کہاں!
یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں — لطف سارے اسی کے دم سے ہیں
اس کے دم سے ہے اپنی آبادی — قید ہم کو بھلی، کہ آزادی؟
سو طرح کا بنوں میں ہے کھٹکا — واں کی گزران سے بچائے خدا!
ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا — ہم کو زیبا نہیں گلہ اس کا
قدر آرام کی اگر سمجھو — آدمی کا کبھی گِلہ نہ کرو
گائے سُنکر یہ بات شرمائی — آدمی کے گِلے سے پچھتائی
دل میں پرکھا بھلا بُرا اُس نے — اور کچھ سوچ کر کہا اس نے

یُوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی!

(ماخوذ)

آئیے!

بڑوں کو سمجھائیں سگریٹ نہ سُلگائیں

سگریٹ وہ غیر محسوس زہر ہے جو ہماری زندگی کو گھُن کی طرح چاٹ جاتا ہے اور بالآخر مُوذی امراض اور تکلیف دہ موت کے انجام سے دوچار کرتا ہے۔

سگریٹ نشہ ہے جو ہم سے ہماری فعال اور متحرک زندگی چھین کر ہمیں سُستی، کاہلی اور بے ہمتی کے روگ دیتا ہے۔

سگریٹ وہ لت ہے جو مضبوط ارادوں اور آہنی عزائم کے قلعوں کو مسمار کر دیتا ہے۔

سگریٹ پینے والے کبھی شاہین صفت نہیں ہو سکتے سگریٹ کا دھواں نگلنے والے ہمیشہ صحت مند نہیں رہ سکتے۔

یاد رکھیے ہمارے اطراف جب کوئی سگریٹ پی رہا ہوتا ہے تو اُس کا دھواں اُسی کی رگوں میں اندھیرے نہیں بھرتا بلکہ ہماری سانسوں میں شامل ہو کر ہماری رگ و پے میں بھی اُترتا ہے۔ **توپھر ـــــ ہم احتجاج کیوں نہ کریں** سگریٹ پینے والے اپنے بزرگوں کو کیوں نہ سمجھائیں کہ سگریٹ انہی کی نہیں ہماری بھی قاتل ہے۔ اچھے لہجے میں، شائستہ طریقے سے مہذب بچوں کی طرح... آیئے اپنے بڑوں کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پھینک دیں اور ان کی درازئ عمر کی دعائیں مانگیں آنکھ مچولی کی "سگریٹ چھوڑ تحریک" میں شامل ہو کر اسے موثر بنائیے۔

وزارت صحت اسلام آباد کو بھی آپ سب خط لکھیئے کہ حکومت سگریٹ کے اشتہارات پر پابندی لگادے۔ قومی صحت کو تباہ کرنے والے اشتہارات پر پابندی بھی ضروری ہے۔

انجانی مُہم

امجد اسلام امجد

آخری قسط

صفدر، منصور اور ذیشان آپس میں گہرے دوست ہیں۔ لاہور جانے کے لئے وہ کراچی اسٹیشن سے ٹرین پر سوار ہوئے دوران سفر ایک پراسرار شخص جس نے نیلا کوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ ان سے باتیں کرنے لگا۔ دوران گفتگو منصور کے ہاتھ میں ذیشان نے ایک پرچی تھمائی جس پر کوڈورڈ کا ایک جملہ تحریر تھا۔ باتھ روم جاکر منصور نے پرچی دیکھی تو اس پر درج تھا کہ...... ھوبڑ ناثواگ ہوام یا...... یعنی یہ آدمی ٹھیک نہیں ہے...... منصور ہاتھ دھو کر باتھ روم سے نکلا سے اسے شدید حیرت ہوئی کیونکہ نیلے کوٹ والا غائب تھا۔ لیکن اس کا کوٹ نشست پر موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنا کوٹ چھوڑ کر سوٹ کیس لے کر روانہ ہو گیا۔ اچانک منصور نے اپنے سامان کو دیکھا تو پتہ چلا کہ نیلے کوٹ والا اپنا سوٹ کیس چھوڑ کر ان کا سوٹ کیس لے گیا ہے۔ اتنے میں ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی۔ ٹرین تھوڑی دیر کے لئے اسٹیشن پر

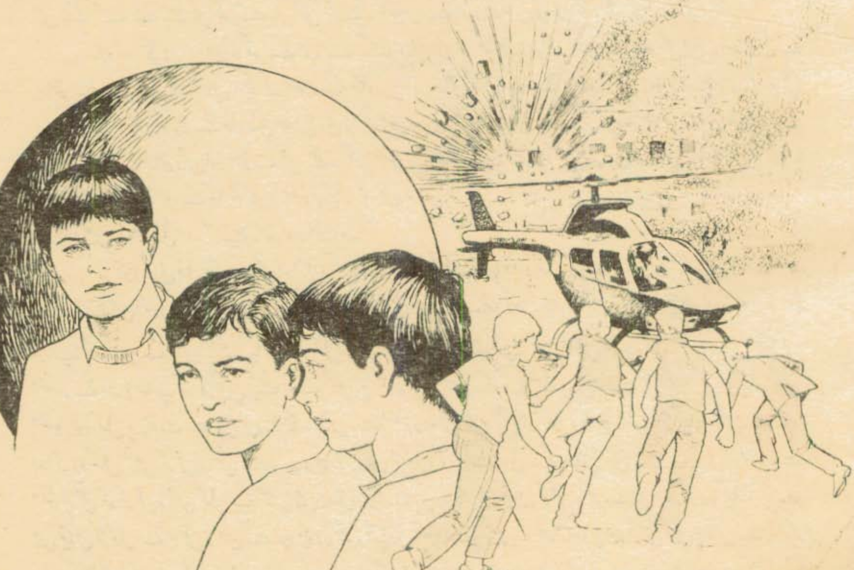

رکی اور پھر چل پڑی۔ جس علاقے سے ٹرین گزر رہی تھی وہ ملٹری کا علاقہ تھا۔ ذیشان نے اپنا شک ظاہر کیا کہ ممکن ہے نیلے کوٹ والا مشتبہ شخص چیکنگ کے خوف سے یہ سوٹ کیس یہاں چھوڑ گیا ہو۔ ابھی وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ پولیس انسپکٹر سامان کو شک بھری نظروں سے دیکھتا ہوا وہاں آ پہنچا۔ پولیس انسپکٹر سوٹ کیس اور نیلے کوٹ کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ اور تلاشی لینا چاہی، مگر ذیشان نے انسپکٹر کو ایک کارڈ دیتے ہوئے بتایا کہ وہ کرنل رحمان کے پرائیوٹ سیکرٹ سروس کے رکن ہیں۔ اس پر انسپکٹر مطمئن ہو کر چلا گیا رات کو جب اندھیرا چھا گیا تو کھانا کھانے کے بعد ذیشان منصور اور صفدر سوٹ کیس لے کر باتھ روم میں گئے اور اپنے پاس پہلے سے موجود ماسٹر چابی کے ذریعے اسے کھولنے کی کوشش کی۔ سوٹ کیس میں سونے کی اینٹیں اور ہیرے جگمگا رہے تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ لاہور پہنچ کر خالو کی مدد سے اس سوٹ کیس کی بابت پولیس کو بتائیں گے۔ لاہور پہنچنے کے بعد جب وہ اسٹیشن سے باہر آئے تو ایک ٹیکسی ان کے قریب آ کر رکی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا کہ میں آپ کو آپ کی منزل پر چھوڑ دوں گا۔ تشریف رکھیں۔ ذیشان، منصور اور صفدر ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی چل دی۔ تھوڑی دیر بعد ٹیکسی جب شہر کو چھوڑ کر ویرانے کی طرف جانے لگی تو صفدر چلایا...... یہ کیا حرکت ہے؟ اس پر ڈرائیور نے اپنے چہرے پر سے سرکے ہوئے ہیٹ کو ہٹا کر دیکھا اور ان پر پستول تان لی...... تینوں سہم گئے۔ یہ تو وہی شخص تھا نیلے کوٹ والا۔ ٹیکسی چلتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک غیر آباد علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ انہیں گھنی جھاڑیوں میں ہی ایک عمارت میں لے جایا گیا۔ اندر تاریک شیشوں کی عینک چڑھائے میگھاری نام کا ایک شخص انہیں ملا۔ یہ چیف باس کا نائب تھا۔ وہاں موجود غنڈے اور میگھاری ان تینوں کو کرنل رحمٰن کے حوالے سے اچھی طرح جانتا تھا۔ چنانچہ اس کے حکم سے تینوں کو ایک تنگ و تاریک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ مگر رات کو وہ کسی نہ کسی طرح اس عمارت سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب وہ اپنے خالو کے گھر پہنچے تو وہاں سے تیز بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اندر سے آنے والی آوازیں میگھاری۔ دھاریوال اور ان کے خالو کی تھیں۔ دھاریوال کو اچانک ان کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ مگر وہ اس کے آنے سے پہلے ہی گھر سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے جو دیکھا اس کی ان کو بالکل توقع نہ تھی۔

جمبو اور گیڈو ان کو گھر کے اندر لے گئے۔ وہاں ان پر انکشاف ہوا کہ صفدر کے خالو بھی ان بدمعاشوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ انہیں دیکھ کر صفدر کے خالو ...... حاجی کمال بیگ نے ایک ٹرانس میٹر پر اپنے باس کو کرنل رحمان کے ارکان کو پکڑ لئے جانے کی اطلاع دی۔ تھوڑی دیر بعد میگھاری ان کو لے کر کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ تین اور غنڈے بھی تھے۔ مگر منصور نے چالاکی سے کام لیا تینوں لڑکوں نے ان بدمعاشوں پر قابو پا لیا۔ پھر منصور نے ان کے کوارٹر کا پتہ معلوم کیا۔ اور ان کو اس طرف لے چلا۔ ابھی ان کے پیدل سفر کا آغاز ہی ہوا تھا کہ انہیں آواز آئی "اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو۔"

یہ آواز حاجی کمال بیگ کی تھی جو اسٹین گن لے ان کی طرف آ رہا تھا۔ کمال کو دیکھ کر جمبو اور میگھاری کو بہت تعجب ہوا۔ اتنے میں انہوں نے دھاریوال کو زخمی حالت میں اپنی طرف آتے دیکھا۔ پھر وہ تینوں صفدر ذیشان اور منصور کو لے کر اپنے بگ باس کے پاس پہنچے۔ باس نے کمال کو ان تینوں کے ساتھ اپنے کمرے میں طلب کیا۔ کمرے میں پہنچ کر منصور نے منہ ڈھانپ کر کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص پر حملہ کیا مگر اس کے گرد شیشے کی دیوار سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا۔ تبھی منصور اور کمال پر چھت سے پانی برسنے لگا۔ جس سے منصور ہوش میں آ گیا اور کمال کا میک اپ اتر گیا۔ جس سے ظاہر ہوا کہ وہ کمال نہیں کرنل رحمٰن تھے۔ یہ دیکھ کر یہاں لڑکوں کو حیرت ہوئی۔ بگ باس یعنی ہا کسمن ولیم کو یہ بات معلوم تھی کہ کرنل رحمٰن کمال کے بھیس میں یہاں پہنچ گئے ہیں۔ پھر ان تینوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ کمرے میں تینوں لڑکوں نے کرنل رحمٰن سے ان تینوں تک پہنچنے کی تفصیلات پوچھیں۔ تھوڑی دیر بعد اصلی کمال پولیس سے رہا ہو کر وہاں آ پہنچا اور باس کی ہدایت پر ان چاروں کو لے کر ہیڈ کوارٹر جا پہنچا۔ پھر لفٹ کے ذریعے انہیں اس زیر زمین دوز بستی میں

لے جایا گیا جہاں انتہائی بڑی بڑی شخصیتیں اغواء ہونے کے بعد سے قید تھیں۔ ان سب کے نام بستی کی ایک اسکرین پر چاروں کے سامنے ظاہر ہو رہے تھے۔ ان میں ایک نام دیکھ کر وہ سب چیخ اٹھے۔

اسکرین پر کرنل نقوی کا نام روشن تھا جن کے بارے میں اطلاع تھی کہ انہیں حکومت نے گرفتار کر کے انتہائی سخت حفاظت میں رکھا ہے۔ دھاریوال نے ان چاروں کو بتایا کہ دراصل قید ہونے والا کرنل نقوی، کرنل نقوی کی ڈمی ہے۔ پھر ان چاروں کو خوبصورت کمروں میں قید کر دیا گیا جہاں ویڈیو کیمرے اور مائکرو فون نصب تھے تھوڑی دیر بعد دھاریوال ان چاروں کو لے کر زمین دوز بازار کی سیر کو نکلا۔ بازار میں بہت سے لوگ مخصوص ٹوکنوں کے ذریعہ خریداری کر رہے تھے۔ یہ ٹوکن انہیں منشیات اور اسلحہ ساز فیکٹریوں میں کام کرنے کے عوض ملے تھے۔ ان چاروں کو بازار میں موجود کسی شخص سے بات چیت کی اجازت نہ ملی وہ گھومتے گھومتے فیکٹریوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اچانک فیکٹریوں کے سائرن زور سے چیخنے لگے۔ دراصل کرنل رحمٰن دھاریوال کی نظر بچا کر فیکٹری کے اس کمرے میں پہنچ گے تھے جہاں کمپیوٹر نصب تھے۔ تھوڑی دیر بعد فیکٹری سے دھماکے کی آواز آئی۔ دھاریوال کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ذیشان، منصور اور صفدر وہاں سے بھاگ نکلے۔ خوفزدہ ہو کر بھاگنے والے لوگوں کے ہجوم نے دھاریوال کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کرنل رحمان بھی ان سے آملے اور یہ لوگ زمین دوز شہر سے باہر نکلنے کا رستہ تلاش کرنے لگے۔ صفدر کے بتانے پر وہ سب لوگ ایک نیم تاریک طویل سرنگ میں داخل ہو گئے۔ سرنگ میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا لیکن اندھیرا بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ اس سرنگ کا اختتام ایک بڑے سے دروازے پر ہوا۔ کافی تلاش کرنے کے بعد اس دروازے کا میکنیزم ملا اور دروازہ کھول کر وہ لوگ دوسری طرف چلے گئے۔ یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جو پہاڑ کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ ایک طرف لوہے کا جنگلہ ساتھا جس کے دوسری طرف نیم مردہ افراد یاس سے بغاوت کی سزا بھگت رہے تھے۔ اچانک کمرہ قہقہوں کی آواز سے گونج اٹھا اور یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ کرنل رحمان اصل رحمان نہیں بلکہ ان کی ڈمی ہیں۔ لیکن جلد ہی اصل رحمان بھی ان کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور پھر دونوں رحمانوں کی درمیان خطرناک جنگ کا آغاز ہو گیا۔ ڈمی رحمان نے دھوکے سے ان سب کو ایک جنگلے میں قید کر دیا جس کا فرش بھی لوہے کا تھا اور اس میں بجلی کا کرنٹ دوڑا دیا۔ کمرہ انسانی چیخوں سے گونج رہا تھا کہ اچانک زلزلے نے صورت حال کو اور بھی خطرناک کر دیا اس کمرے کی چھت ایک دھماکے سے زمین پر آرہی اور انسان اپنی چیخوں سمیت اس کے نیچے دب گئے۔

ذیشان، صفدر اور منصور کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ اب تک تو وہ گیند کی مانند لڑھک رہے تھے لیکن جیسے ہی پہاڑ کا تراشیدہ حصہ اچانک زمین پر آگرا، انہوں نے اپنی آنکھوں سے ڈمی کرنل رحمٰن کو اس دیوار کے تلے دفن ہوتے دیکھا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی آخری چیخ بڑی بھیانک تھی۔

اب وہ چاروں ایک اندھیری قبر میں قید ہو چکے تھے۔ غالباً زلزلے کے باعث اس علاقے میں بجلی کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا اور یہی بات ان کی زندگی کی ضمانت بن گئی تھی کیوں کہ اب اس کمرے کے فرش میں کرنٹ نہیں دوڑ رہا تھا۔

کچھ دیر بے سدھ پڑے رہنے کے بعد صفدر نے ہمت کی اور اپنی تمام قوت کو جمع کر کے ادھر اُدھر

ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس نے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر اپنے ساتھیوں اور انکل رحمٰن کو آوازیں بھی دینا شروع کر دیں۔ چند ہی لمحوں بعد اسے انکل رحمٰن کی آواز سنائی دی جو کہہ رہے تھے۔ "بیٹا، گھبرانا نہیں، انشاء اللہ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ضرور مل جائے گا۔" صفدر کو اس وقت انکل کی یہ بات بڑی عجیب سی لگی۔ قبر نما اس کمرے کی گھٹن میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پھر صفدر کو دھندلی سی روشنی دکھائی دی۔ یہ انکل رحمٰن تھے جو اپنا لائیٹر جلا کر ان تینوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔

صفدر نے انہیں آواز دی۔ "میں یہاں ہوں انکل۔" کرنل رحمٰن تیزی سے اس کی طرف آئے۔ انہیں راستے میں ٹھوکر لگی۔ وہ بے ہوش پڑے ہوئے منصور سے ٹکرا گئے تھے۔ انہوں نے جلدی سے منصور کو اٹھا کر صفدر کے قریب لٹا دیا۔ اس وقت انہیں، ذیشان کی کراہ سنائی دی اب کیا کریں انکل۔ یہاں تو سانس لینا بھی مشکل ہے" صفدر نے پریشان ہو کر کہا۔

"گھبراؤ مت بیٹے۔ اللہ کی ذات سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئے اسی کو یاد کرو۔" انکل رحمٰن نے یہ کہہ کر لائیٹر بجھا دیا اور وہ سب پھر تاریکی کا حصہ بن گئے۔

"انکل" صفدر نے بے تابی سے کہا "ہمیں یہاں سے نکلنے کا راستہ تلاش..........." اسی وقت ایک زور دار جھٹکا لگا، صفدر اپنی بات مکمل نہ کر سکا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ زمین ایک بار پھر شدت سے ہلنے لگی تھی۔

"اوہ۔ پھر زلزلہ۔ !" انکل رحمٰن کی آواز آئی۔

زمین بُری طرح لرزنے لگی تھی، پھر ایک پُرشور آواز آئی اور ایسا لگا کہ بہت سے تودے لڑھک گئے ہیں، اس کے ساتھ ہی انہیں محسوس ہوا کہ تازہ ہوا کا جھونکا اندر کو چلا آیا ہے۔ ان کے چاروں طرف اب بھی تاریکی تھی۔

"مبارک ہو بچّو۔" انکل رحمٰن پُرجوش لہجے میں بولے۔ "اللہ کا شکر ہے کہ یہ زلزلہ ہماری رہائی کا پیامبر بن کر آیا ہے۔ آؤ دیکھو، مجھے سورج کی روشنی نظر آرہی ہے۔

آؤ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ "انکل رحمٰن نے کہا۔ وہ چاروں اسی دراڑ کی سمت بڑھنے لگے جس سے روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ یہ دراڑ خاصی بلندی پر تھی۔ انکل رحمٰن کی تجویز پر منصور نے اس دراڑ تک پہنچنے کے لئے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ وہ کوہ پیمائی کا اچھا تجربہ رکھتا تھا۔ ابھرے ہوئے پتھروں پر احتیاط سے قدم جماتے ہوئے وہ دراڑ تک جا پہنچا۔ خوش قسمتی سے مٹی بھربھری تھی۔ منصور نے اپنے چاقو کی مدد سے ذرا سی دیر میں اس دراڑ کو ایک چوڑے شگاف میں بدل ڈالا۔ ایک ایک کر کے وہ چاروں

اس شگاف سے باہر نکل آئے۔
ان سب کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکلی۔ وہ چاروں کسی وادی میں تھے جو خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ انہیں زیر زمین لے جانے والی لفٹ آدھے گھنٹے تک کیوں سفر کرتی رہی تھی۔
"میرا خیال ہے، ہمیں اب یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے۔"
انکل رحمٰن نے کہا۔
"جی نہیں انکل۔ میں اپنے وطن کے بدترین دشمن کو ٹھکانے لگائے بغیر نہیں جاؤں گا۔ اور پھر ان بے گناہ لوگوں نے کیا قصور کیا ہے جو یہاں قید میں پڑے سسک رہے ہیں۔" یہ منصور کی آواز تھی۔
"بالکل انکل منصور ٹھیک کہہ رہا ہے۔" صفدر نے کہا۔
"جی ہاں ۔ انکل میرا بھی یہی خیال ہے" ذیشان بولا۔
انکل رحمٰن نے تینوں بچوں کو محبت سے اپنے ساتھ لپٹالیااور جذبات سے بوجھل آواز میں بولے۔
"اللہ تمہیں اور ہمت دے میرے بچّو۔ اگر میرے وطن کو تم جیسے ایک ہزار جوان مل جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔وہ چاروں احتیاط سے دیکھتے بھالتے آگے بڑھے۔ کچھ دور جاکر پہاڑوں کا سلسلہ دائیں سمت مڑ گیا تھا۔ وہ جوں ہی دایاں موڑ مڑے انہیں اچانک ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ سامنے ایک بڑا سا ہیلی پیڈ تھا، جس پر ایک ہیلی کاپٹر کھڑا ہوا تھا۔
اس وقت ایک طرف سے ایک بوڑھا شخص نمودار ہوا، وہ ذرا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ اس کی جھریوں بھرے چہرے پر بیزاری تھی، لیکن اس کی آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ اس نے ان چاروں کو محض ایک نظر دیکھا پھر، لڑکھڑاتا ہوا، ہیلی کاپٹر میں چڑھنے لگا۔ اسی وقت ایک لمبے قد کا سفید فام شخص تیزی سے دوڑتا ہوا آیا اور ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گیا۔

اگلے ہی لمحے منصور دیوانہ وار دوڑتا ہوا ہیلی کاپٹر کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو چکا تھا۔ اس کا یہ اقدام بے حد خطرناک تھا۔ منصور نے ہیلی کاپٹر میں داخل ہوتے ہی سفید فام شخص پر چھلانگ لگا دی جو پائلٹ کی نشست پر بیٹھا کل پرزوں کو حرکت دے رہا تھا۔ اسی وقت ذیشان صفدر اور منصور بھی ہیلی کاپٹر میں گھس آئے۔
منصور نے سفید فام شخص کو پائلٹ کی نشست سے پیچھے کھینچ لیا تھا۔" انکل آپ ہیلی کاپٹر

سنبھالیں"۔ صفدر نے بوڑھے شخص کو پکڑ رکھا تھا اور منصور سفید فام شخص کی مرمت کر رہا تھا۔ ذیشان بھی اس "اہم کام" میں ہاتھ بٹانے لگا!

منصور کی ٹھوکر ہاکسن کے گھٹنے پر پڑی۔ ہاکسن کی کراہ بلند ہوئی۔ اس نے تڑپ کر کہنی منصور کے پیٹ پر مارنی چاہی لیکن منصور پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ ہاکسن اپنے ہی زور میں آگے جاکر گرا۔منصور نے اسے پھر اٹھنے کا مہلت نہ دی۔پلک جھپکنے میں اس کی جیب سے ریوالور نکال لیا اور بولا۔
"اب آپ اٹھ سکتے ہیں"۔

ہاکسن چپ چاپ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ریوالور کے اشارے پر ہیلی کاپٹر سے نیچے اتر آیا۔ صفدر نے بوڑھے کو نیچے اتارا بوڑھا شخص شاید گونگا تھا۔ اس نے اس طرح اتارے جانے پر "اوں اوں کر کے احتجاج کیا" بہر حال وہ سب آگے بڑھے منصور نے ہاکسن کی کمر سے ریوالور لگا رکھا تھا اور اسے آگے بڑھنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ بوڑھا لنگڑا لنگڑا کر چل رہا تھا پھر وہ ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گرا اور اپنا گھٹنا پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بوڑھے چہرے پر اذیت کی لہریں پھیل گئی تھیں۔

صفدر تم یہیں رکو۔ "انکل رحمٰن نے کہا۔ اس بوڑھے کی نگرانی کرنا۔ ہم اندر کا جائزہ لے کر آتے ہیں۔ وہ تینوں ہاکسن کو لے کر آگے بڑھ گئے۔

ہاکسن کی رہنمائی میں وہ سب ایک جگہ پہاڑی کے دامن میں بنے ہوئے نشیبی راستے پر اترنے لگے کچھ آگے جاکر ہاکسن نے ایک خاص جگہ تین بار پیر مارا اس کے ساتھ ہی زمین میں ایک بڑا دروازہ سا کھل گیا جس میں اندر سیڑھیاں جا رہی تھیں وہ سب نیچے اترنے لگے۔

اندر ایک طویل سی راہداری تھی وہ سب اس میں چل رہے تھے تو ان کے جوتوں سے دھمک پیدا ہو رہی تھی۔ اچانک ہاکسن زور زور سے کھانسنے لگا وہ کھانستے کھانستے دہرا ہو گیا تھا وہ سب اسے دیکھنے کے لئے آگے بڑھے، ہاکسن نے الٹی کک منصور کے ہاتھ پر ماری منصور کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر دور جاگرا اور ہاکسن نے دوڑ لگا دی منصور اسکے پیچھے تھا۔ وہ سب دوڑ پڑے۔

رہداری آگے جاکر کافی کشادہ ہو گئی تھی۔ ذیشان اور انکل رحمٰن جوں ہی اس کشادہ حصہ میں پہنچے حیرت زدہ رہ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ منصور تو ہاکسن سے گتھم گتھا ہے اور صفدر اسی گونگے بوڑھے سے ہاتھا پائی کر رہا ہے ان دونوں کو وہ سرنگ سے باہر چھوڑ آئے تھے ذیشان اور انکل رحمٰن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ صفدر اور بوڑھا زیر زمین آئے کیسے۔

بوڑھے میں خدا جانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی وہ چیتے کی طرح اچھل کر صفدر سے لڑ رہا تھا۔ دونوں اتنی تیزی سے اپنی جگہ بدل رہے تھے کہ ذیشان اور انکل رحمٰن کے لئے صفدر یا منصور کی مدد کرنا بڑا مشکل تھا۔

ایک موقع پر صفدر نے بوڑھے کی گردن جکڑنے کی کوشش کی بوڑھا تڑپ کر اسکی گرفت سے نکل گیا لیکن اس کے بال صفدر کی مٹھیوں میں آگئے صفدر نے بوڑھے کے بال کھینچے تو ایک جھٹکے کے ساتھ بوڑھے کے چہرے پر سے ماسک بالوں سمیت اتر گیا۔اندر سے نیلی آنکھوں سفید رنگت اور بھورے بالوں والا ایک جوان چہرہ نمودار ہوا۔ اس چہرے پر بڑی سفاک مسکراہٹ تھی۔ وہ شخص جست لگا کر ایک طرف ہو گیا اور اس نے فاتحانہ انداز میں کہا "دوستو، اس زیر زمین دنیا سے فرار ہونا تمہارے نصیب میں نہ تھا۔ اب تم لوگ زندگی کی آخری سانسیں یہیں پوری کرو گے، میں تو چلا۔ ہاکسن کی طرف سے الوداع ...... بائی بائی !

وہ تمام لوگوں کو حیرت زدہ چھوڑ کر ایک طرف کو تیزی سے ہٹا پھر اس نے ایک طرف لگے ہوئے سرخ اور زرد رنگ کے بٹن دبا دیئے بٹن دبتے ہی ایک دیوار ایک طرف کو سرک گئی اور ہاکسن نے اندر چھلانگ لگا دی لیکن اگلے ہی لمحے ہاکسن کی دردناک چیخ اس سرنگ نما راہداری میں گونج اٹھی۔ وہ سب اس طرف لپکے اس دوران میں منصور اس سفید فام شخص کی ریڑھ کی ہڈی پر ایک کاری ضرب لگا کر اسے بے بس کر چکا تھا جسے کچھ دیر تک وہ ہاکسن سمجھ رہا تھا۔سفید فام شخص کو اس کے حال پر چھوڑ کر وہ بھی اسی طرف بھاگا جدھر ذیشان صفدر اور انکل رحمٰن دوڑے تھے وہ تینوں اسی سرنگ میں جھانک رہے تھے جس میں ہاکسن نے چھلانگ لگائی تھی۔

ہاکسن کی قسمت اس کا ساتھ عین وقت پر چھوڑ گئی تھی۔ زلزلہ کے باعث سرنگ آگے جاکر بہت گہری کھائی بن گئی تھی۔ ہاکسن سمجھے بیٹھا تھا کہ وہ سرنگ سے دوڑتا ہوا باہر نکل جائے گا لیکن سرنگ کھائی میں بدل چکی تھی۔ وہ ہزاروں فٹ گہرائی میں جاگرا تھا۔یقیناً اس کی ہڈیوں کا سرمہ بن گیا ہوگا

"اس کا یہی انجام ہونا تھا" انکل رحمٰن بولے۔پھر چونک کر کہنے لگے۔ "فوراً یہاں سے نکلو۔ مجھے خدشہ ہے کہ ہاکسن جاتے جاتے کوئی شرارت کر گیا ہے" وہ سب الٹے قدموں دوڑے منصور صفدر اور ذیشان نے بھی گیس کی بو محسوس کرلی تھی۔ ہاکسن ان سب کو یہیں ہلاک کر دینا

چاہتا تھا۔

راستے میں وہی سفید فام شخص کراہتا ہوا ملا۔ منصور نے اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس کی ریڑھ کی ہڈی پر شدید ضرب لگی تھی، وہ چیخیں مار کر رہ گیا۔ آخر منصور اور صفدر نے مل کر اسے اٹھالیا اور سرنگ کے دروازے کی سمت دوڑے گیس کی بو تیز ہوتی جا رہی تھی۔

باہر نکلنے کا میکنزم تلاش کرو جلدی۔ ورنہ یہیں سب دفن ہو جائیں گے۔ انکل رحمٰن نے چیخ کر کہا۔

اسی وقت اس سفید فام نے جسے منصور اور صفدر نے اٹھار کھا تھا، کراہ کر کہا "سفید دائرے پر سرخ رنگ کے پانچ ستارے بنے ہوں گے۔ اس سفید دائرے کو دباؤ۔"

کچھ تلاش کے بعد ایک جگہ انہیں دیوار پر خوبصورت ڈیزائن بنا نظر آیا۔ اس ڈیزائن میں سے کئی سفید دائرے تھے اور ان پر سرخ ستارے بھی تھے لیکن پانچ ستارے صرف ایک سفید دائرے پر تھے۔ ذیشان نے جھپٹ کر اس دائرے کو دبا دیا۔ ایک شور کے ساتھ سرنگ کا دروازہ کھل گیا۔ وہ سب ہانپتے ہوئے باہر نکل آئے۔

"یار صفدر تم اندر کس طرح پہنچ گئے" منصور نے باہر نکل کر پوچھا۔

"کچھ نہ پوچھو یار۔ وہ بوڑھا یعنی ہاکسن غضب کا چالباز تھا۔ اس نے بڑی عاجزی سے مجھ سے اشاروں میں کہا کہ اس کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ میں ذرا اس کی طرف سے غافل ہوا اور وہ دوڑ پڑا، ایک جگہ کانٹے دار جھاڑیاں ایک خاص ترتیب سے اگی ہوئی تھیں وہیں وہ اچھلنے لگا، اچھلتے ہوئے اس نے پاؤں زمین پر مارا اور زمین میں دروازہ سا کھل گیا۔ اس نے اندر چھلانگ لگائی تو میں بھی اندر کود گیا۔"

"آؤ اس بستی کی صورتحال کا جائزہ لیں۔" "انکل رحمٰن نے کہا۔" آہ سفید فام شخص کراہا جسے وہ سرنگ سے نکال کر لائے تھے سب کی توجہ اس کی طرف ہو گئی۔ سفید فام شخص کی حالت بڑی خراب تھی۔ منصور کی ضرب شاید بہت شدید تھی۔ انکل رحمٰن نے اس شخص سے پوچھا۔ تم کون ہو؟۔"

"میں" سفید فام شخص کراہا۔ "میں پیٹر ہوں۔ ہاکسن کا پرانا خادم۔ مگر مجھے اس سے نفرت ہے۔"

ان سب نے مل کر پیٹر کو ایک سایہ دار جگہ پر لٹا دیا۔

پیٹر نے انہیں بتایا کہ وہ کس طرح محفوظ طریقے پر اس زیر زمین بستی میں داخل ہوسکتے ہیں اور مہلک گیس کے اخراج کو بند کرنے کا کنٹرول کس کمرے میں ہے۔ وہ سب پیٹر کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اس بستی میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے بستی کا کونہ کونہ چھان مارا۔انہیں لاتعداد قیدی ملے۔ اسلحہ اور منشیات کی فیکٹری کا آدھے سے زیادہ حصّہ زلزلے کی وجہ سے تباہ ہوچکا تھا۔ ایک جگہ انکل رحمٰن کو چند مواصلاتی آلات صحیح حالت میں مل گئے۔ ان کی مدد سے انہوں نے ہیڈ کوارٹر سے مدد طلب کرلی۔کچھ ہی دیر میں یہاں فوجی ہیلی کاپٹر کی مدد سے چھاتہ بردار فوج اتر رہی تھی۔ ہیلی کاپٹروں کی ضرورت اس لئے بھی پڑی کہ اس دشوارگزار وادی تک جیپوں کے ذریعہ پہنچنا نہایت مشکل تھا۔ ہیلی کاپٹروں سے تین ڈاکٹر بھی اترے۔ انہوں نے زخمی منصور اور صفدر کو طبّی امداد دی۔ اور پیٹر کا معائنہ کیا۔ ایک ڈاکٹر نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا "اس کی پیٹھ کسی سخت چیز سے ٹکرائی ہے۔ اب شاید یہ زندگی بھر کے لئے معذور ہوجائے۔" لیکن پیٹر معذوری کی زندگی گزارنے سے پہلے ہی اسی شام چل بسا۔اس نے اپنے پاس موجود زہریلا کیپسول کھا کر خودکشی کرلی تھی۔اس بین الاقوامی گروہ کے پندرہ ارکان گرفتار کرلئے گئے۔

اس میں میگھاری بھی تھا اور حاجی کمال بیگ بھی دھاریوال کی لاش مل گئی تھی۔ ہاکسن کی لاش بڑی جدوجہد کے بعد فوجیوں نے نکالی۔

حاجی کمال بیگ نے عدالت میں وعدہ معاف گواہ بن کر اعتراف کرلیا تھا کہ یہ گروہ ملک میں دھماکے کرواتا ہے اور نوجوانوں کو منشیات کا عادی بنانے میں مصروف ہے اور یہ سب کچھ ایک بڑی طاقت کے اشارے پر ہوتا ہے۔ پھر حاجی کمال بیگ نے عدالت میں افسردگی کے ساتھ کہا تھا "یہ محض ایک گروہ نہیں بلکہ بہت بڑا بین الاقوامی جال ہے اور اس کے تحت دو درجن سے زائد گروہ اب بھی باہر ملک میں سرگرم عمل ہیں۔"

حاجی کمال بیگ کو عمر قید کی سزا دی گئی گروہ کے بقیہ ارکان کو سزائے موت سنائی گئی۔

انکل رحمٰن کے سادہ سے ڈارئنگ روم میں چاولوں کی پلیٹ سے آخری لقمہ لیتے ہوئے منصور نے کہا "انکل ہم اس زندگی کے آخری لمحے تک ان وطن دشمنوں کے خلاف جہاد جاری رکھیں گے۔" "انشاء اللہ" صفدر، ذیشان اور انکل رحمٰن نے ایک ساتھ کہا۔

ان چاروں کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

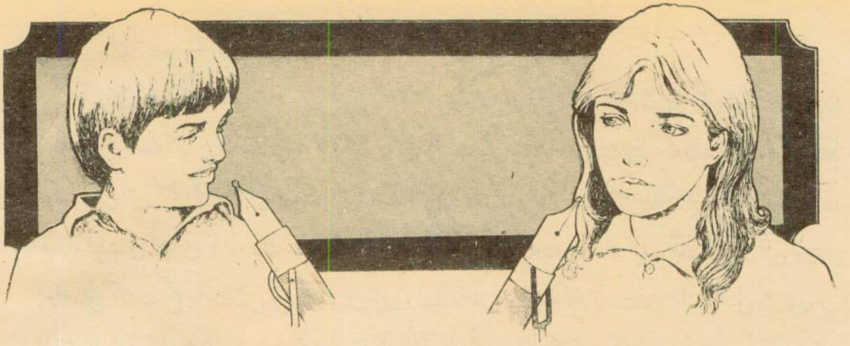

تحریری مباحثے میں پہلا انعام حاصل کرنے والی دو خوبصورت تحریریں

"لڑکیاں ماں باپ کی زیادہ فرمانبردار ہوتی ہیں"

موافقت

نازیہ جبین اسلام آباد

یہ ایک سچی حقیقت ہے جس کے بارے میں اگر کوئی مضمون ، کوئی نظم یا دلائل نہ بھی دیئے جائیں تو بھی ساری دنیا جانتی ہے اور کہتی ہے کہ آج کل کے لڑکے نافرمان ہیں۔ مگر میں پھر بھی چند ایک دلائل پیش کرتی ہوں کہ "دلائل سے قائل" کرنا اچھی بات ہے۔

والدین کی نافرمانی کرنے کی واضح مثال آج کل کی تعلیم میں لڑکوں کا زیادہ تعداد میں فیل ہونا، نقل کرنا، فیل ہونے کے بعد ہنگامے کرنا ہے۔ لڑکیاں چونکہ فرمانبردار ہوتی ہیں لہٰذا وہ والدین کی خواہش کے مطابق سارا سال محنت سے پڑھتی ہیں اور گھر کے کام کاج میں ماں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ جبکہ لڑکے عموماً تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی باپ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ لڑکیاں گھر کا کام بھی کرتیں اور پھر امتحانات میں چاہے وہ مڈل کا ہو یا میٹرک یا بی۔ اے کا، اچھی پوزیشن عموماً طالبات لیتی ہیں۔ اور لڑکے والدین کی نافرمانی کرتے ہیں۔ سارا سال کھیل کود ہنگامہ آرائی میں گزارتے ہیں۔ آخر میں کارتوس بناتے ہیں مگر افسوس نقل کرنے کے باوجود "رزلٹ گزٹ" میں لڑکوں کی بڑی تعداد "ڈی گریڈ" لئے

ہوئے نظر آتی ہے۔ دو یا تین پیپرز میں ہر پانچواں لڑکا فیل ہوتا ہے۔ ٹھہرے جو والدین کے نافرمان ...... اور نافرمانوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔

اخبارات میں روزانہ جو چوری، ڈکیتی، قتل، مار دھاڑ، اسمگلنگ اور ہنگامہ آرائی کے واقعات نظر آتے ہیں، کیا یہ سب کچھ لڑکیاں کرتی ہیں...... ؟! یا ان واقعات میں لڑکے ہی ملوث ہوتے ہیں...... کیا یہ سب کچھ کرنا والدین کی فرمانبرداری میں شمار ہوتا ہے؟ ٹھیک ہے کہ حالات اکثر لوگوں کو بُرے کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مگر معاشرے کی سب سے ستائی ہوئی "صنف" صنف نازک ہی ہے، تو لڑکیاں آخر حالات سے مجبور ہو کر چوری ڈکیتی کیوں نہیں کرتیں؟ صرف اس لئے کہ وہ والدین کی فرمانبردار ہوتیں ہیں۔ کوئی ایسا کام کرنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی ہیں جس سے والدین کی ناک کٹے...... "لڑکے عموماً دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ فرمانبردار ہیں کیونکہ وہ والدین کی اس اوّلین خواہش کو پورا کرتے ہیں کہ ان کی اولاد دنیا میں نام روشن کرے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو اور لڑکے اور مرد حضرات ہی زیادہ تر کارنامے انجام دیتے ہیں اور اعلیٰ عہدوں پر وہی فائز ہوتے ہیں" جبکہ اگر دیکھا جائے تو یہ بات لڑکیوں کو زیادہ فرمانبردار ثابت کرنے میں مدد دیتی ہے۔ دنیا کے چند ایک ترقی یافتہ ممالک کے علاوہ کہیں بھی خواتین کو مرد کے برابر نہیں سمجھا جاتا۔ خواتین اور لڑکیوں کو گھر کی چار دیواری میں رکھنا زیادہ مہذب خیال کیا جاتا ہے۔ لڑکیاں ویسے تو لڑکوں سے زیادہ لائق ہوتی ہیں جیسا کہ میں نے اوپر ثابت کیا ہے مگر چونکہ ان کے والدین کی خواہش نہیں ہوتی کہ ان کے گھر کی عزت باہر کی زندگی میں اپنا کردار ادا کرے، لہٰذا اچھے نمبر لینے کے باوجود وہ فرمانبرداری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے نہ تو مزید تعلیم حاصل کرتیں ہیں اور اگر کر بھی لیں تو عام طور پر ملازمت نہیں کرتیں۔ والدین نہیں چاہتے کہ ان کی لڑکی عمر بھر سیاحت کرے اور "بنت بطوطہ" کے نام سے مشہور ہو جائے۔ یا یہ کہ وہ پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرے یا چاند کو تسخیر کرے۔ اس کے مقابلے میں گھر کے اندر رہنے والی لڑکی کو فرمانبردار اور تابعدار تصور کیا جاتا ہے اور لڑکیاں صلاحیت ہونے کے باوجود ایسے کام نہ کر کے والدین کی فرمانبردار ہونے کا ثبوت دیتی ہیں۔

لڑکیوں کے فرمانبردار ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے ملک کی وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے صنف نازک ہونے کے باوجود اپنی والدہ اور اپنے مرحوم باپ کی خواہشات کی تکمیل کر دی اور وہ ملک جہاں پچھلے گیارہ سالوں سے ان کے والد کا کوئی نام لیوا نہ تھا اسی ملک میں اپنے والد کا چاروں طرف چرچا عام کر دیا۔ جبکہ وزیر اعظم صاحبہ کے بھائی بھی تھے وہ کیوں اپنے والد کا نام روشن نہ کر سکے؟؟ اسی لئے کہ لڑکیوں میں اپنے والدین کی خواہشات کو پورا کرنے کی خواہش زیادہ ہوتی ہے وہ اپنے والدین کو خوش دیکھنے کے لئے ہر وقت بے چین رہتی ہیں۔

یہ والدین کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد مہذب ہو اور اخلاق سے گری ہوئی حرکتیں نہ کرے...... لہٰذا لڑکیاں فرمانبرداری کا ثبوت دیتے ہوئے گھر یا گھر سے باہر کہیں جاتے ہوئے خیال رکھتی ہیں کہ والدین کی عزت پر ان کی وجہ سے کوئی حرف نہ آئے۔ جبکہ لڑکے سڑکوں پر دکانوں پر الغرض کہیں بھی آتے جاتے ہوئے اوچھی حرکتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ خصوصاً آج کل تو ہر لڑکا ہر گلی محلے سڑک پر "اوئے اوئے" کہتا نظر آئے گا۔ فلموں کے ذریعے ہر بُری عادت اپنانا کیا فرمانبرداری ہے......؟؟

اگر وہ فرمانبردار بننا چاہتے ہیں تو بند کر دیں اوئے اوئے کہنا...... کس نے روکا ہے انہیں اچھی عادتیں اپنا کر فرمانبردار بننے سے......؟؟

ایک اور بڑا ثبوت لڑکوں کی نافرمانی کا یہ ہے کہ ہر روز ہر اخبار میں ایک اشتہار چھپتا ہے "عاق نامہ" کے عنوان سے، جس میں ہمیشہ لکھا ہوتا ہے کہ "فلاں لڑکے کو بوجہ نافرمانی کے عاق کیا جاتا ہے" آخر اس میں لڑکے کی نافرمانی کا ذکر ہی کیوں آتا ہے...... صاف ظاہر ہے نافرمان لڑکے ہی ہوتے ہیں لڑکیاں نہیں...... والدین عموماً لڑکے کے زیادہ لاڈ دیکھتے ہیں، ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں، مگر وہ قدم قدم پر نافرمانی کا ثبوت دیتے ہیں یعنی امتحانات میں فیل ہو کر...... پھر کوالیفکیشن نہ ہونے پر نوکری نہیں ملتی تو سخت ہنگامے کرتے ہیں...... نوکری نہ ملنے کے بعد جرائم کرتے ہیں...... حتیٰ کہ شادی کرتے ہیں تو والدین کو یکسر نظرانداز کر کے "بیگم صاحبہ" کے ساتھ الگ گھر لے کر رہنے لگتے ہیں، پھر الزام اپنی بیوی کو دیتے ہیں کہ یہی الگ رہنے کو کہتی تھیں حالانکہ اگر وہ والدین کے فرمانبردار ہوں اور والدین سے محبت کرنے والے ہوں تو بیگم کیا دنیا کی کوئی چیز بھی والدین سے انہیں الگ نہیں کر سکتی۔

لڑکیوں کو تو حضور اکرمؐ نے "رحمت خداوندی" کہا ہے اور رحمت کبھی بھی نافرمان نہیں ہو سکتی............!!!

اردو ادب کے ایک قابل اور زمانہ شناس شاعر حالی نے بھی لڑکیوں کی تابعداری کو تسلیم کیا ہے اور اس سلسلے میں مشہور نظم "چپ کی داد" لکھ کر ایک زبردست، تحریری شہادت پیش کی ہے۔

سنبھل کر اُٹھائیے۔ قدم۔ قلم اور قسم

مخالفت

کاشف شہزاد۔ کراچی

"لڑکیاں والدین کی زیادہ فرمانبردار ہوتی ہیں"

عام لوگوں کے خیال میں لڑکیاں والدین کی زیادہ فرماں بردار ہوتی ہیں مگر اس کی حقیقت کچھ ایسی ہے کہ بقول شاعر، ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

مندرجہ بالا شعر کی روشنی میں ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ لڑکے لڑکیوں کے مقابلے میں والدین کے زیادہ فرمابردار ہوتے ہیں۔

تیسری دنیا کے ممالک کا یہ المیہ رہا ہے کہ وہاں لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دی جاتی رہی ہے۔ متعدد گھرانوں میں لڑکوں کی پیدائش خوش بختی کی علامت سمجھی جاتی ہے جب کہ اس کے برعکس لڑکیوں کو بوجھ اور بد بختی خیال کیا جاتا ہے۔ مگر اسکی وجہ صرف یہ ہے وہ والدین کے بہتر مستقبل کی امید اور ان کے بڑھاپے کا سہارا ہوتے ہیں۔ اس لئے والدین لڑکوں کو زیادہ وقت اور توجہ دیتے ہیں تاکہ آنے والے وقت میں وہ ان کے لئے راحت کا سامان مہیا کر سکیں اور ان کی محنت کا زیادہ سے زیادہ صلہ خدمت کی شکل میں انہیں دیں۔ لڑکے ایسا کرتے بھی ہیں اور والدین کی ہر ممکن خدمت کرتے ہیں۔ رہا سوال لڑکیوں کا تو قبل اس کے وہ والدین کی کسی خدمت کے قابل ہوں عام طور پر ان کی شادی کر دی جاتی ہے۔ لہٰذا ان کے خدمت کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آج کا دور خود غرضی کا دور ہے۔ ہر شخص مادہ پرستی میں مبتلا ہے۔ لہٰذا آج کے والدین بھی اپنے بہتر مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں جن کی تعبیر ان کا بیٹا ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بیٹا ایسا کام کرے جس میں ترقی کے زیادہ امکانات ہوں تاکہ ان کو ان کی محنت کا زیادہ سے زیادہ صلہ ملے اور وہ اپنی بقیہ زندگی آرام و سکون کے ساتھ بسر کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی خواہش اپنی اولاد پر مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر ان کی اولاد کسی وجہ سے ان کی خواہش کا احترام نہ کر سکے تو اسے وہ نالائق اور نافرمان قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک میں والدین لڑکیوں پر کم توجہ دیتے ہیں کیونکہ انہیں ان سے مستقبل میں فائدے کی کوئی توقع نہیں ہوتی۔ وہ انہیں بہت اہمیت دینے کے لئے بھی تیار نہیں

ہوتے۔

آج کے والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بیٹا محض وہ کام کرے جس میں ان کے بہتر مستقبل کے امکانات زیادہ روشن ہوں۔ تیسری دنیا کے ممالک کا یہ المیہ ہے والدین چاہتے کہ ان کا بیٹا ہر خواہش کا احترام کرے۔ یہ چیز نا صرف لڑکوں کی شخصی آزادی ختم کر دیتی ہے بلکہ ان میں خود سری اور نافرمانی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔

تعلیم ہی کے شعبے کو لیجئے۔ اکثر والدین یہ چاہتے ہیں کہ ان کا بیٹا ایسی تعلیم حاصل کرے جس سے آنے والے مستقبل میں زیادہ ملی فائدہ پہنچے، چاہے اس کا اس طرف رجحان ہو یا نہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ذہنی مطابقت کے نہ ہونے کے باعث وہ اس شعبے میں بری طرح ناکام ہو جاتا ہے۔ اور یہ ناکامی اس کے مزاج میں اکھڑپن اور بغاوت کا جذبہ پیدا کرتی ہے، جو کچھ لڑکوں میں تو دبا رہتا ہے اور کچھ میں ابھر کے سامنے آتا ہے۔ ان حالات میں لڑکوں کے پاس دو ہی راستے ہوتے ہیں کہ یا تو اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں یا پھر خود اپنا راستہ منتخب کر کے والدین کا نافرمان کہلائیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ایک طرف تو اس کے تعلیمی میدان تک میں آزادی ختم کر دی جاتی ہے اور پھر ستم ظریفی یہ کہ اسے نالائق و نافرمان قرار دے دیا جاتا ہے۔

اس کے برعکس جہاں تک لڑکیوں کی تعلیم کا معاملہ ہے تو یہ تیسری دنیا کے ممالک کا المیہ ہے کہ یہاں ابھی تک لڑکیوں کی تعلیم کو اہمیت نہیں دی گئی۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک میں تعلیم کو صرف معاش کا ذریعہ تصور کیا جاتا رہا ہے اور وہاں تعلیم کو صرف روزگار حاصل کرنے کی خاطر اہم سمجھا کیا جاتا ہے چونکہ ان ممالک میں لڑکوں کے لئے ہی نوکریاں نہیں تو لڑکیوں کو نوکریاں کہاں سے ملیں گی۔؟

یہی وجہ ہے کہ والدین لڑکیوں کی تعلیم پر توجہ نہیں دیتے دوسری اور اہم وجہ یہ بھی ہے کہ والدین کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا کہ وہ بیک وقت لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو تعلیم دے سکیں۔

لڑکا جب اپنے تعلیمی کیریئر سے نکل کر معاشی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو وہ محنت سے اپنا مقام بناتا ہے اور اپنے والدین کا نام روشن کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے والدین کی خدمت میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔ مگر کچھ عرصے بعد جب وہ شادی کے بندھن میں باندھا جاتا ہے تو اس کا تعلق والدین کے ساتھ ساتھ بیوی سے بھی ہو جاتا ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ کوئی بیوی بھی اپنے شوہر کے والدین کو کبھی بھی اپنے والدین تصور نہیں کرتی اور اس کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ ان سے قطع تعلق کر لے۔ دوسری طرف والدین

یہ چاہتے ہیں کہ ان کا بیٹا ان کے ساتھ ہی رہے ان حالات میں لڑکا دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے اگر وہ اپنے والدین کا ساتھ دیتا ہے تب بھی معاشرہ اس پر لعن طعن کرتا ہے اور اگر اپنی شریک حیات کا ساتھ دیتا ہے تو بھی معاشرے کی نظر میں ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ ان حالات میں اس کے پاس کوئی چارا نہیں ہوتا۔ لہٰذا عام طور پر لڑکوں پر یہ جو الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ شادی کے بعد اپنے والدین کو چھوڑ دیتے ہیں درست نہیں ہے یہاں ایک اور بات جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ جو عورت اپنے شوہر کے والدین کی فرمانبردار نہیں ہوتی وہ اپنے والدین کی کس طرح فرمانبردار ہو سکتی ہے۔

عام روایات کے مطابق شیطان کے بہکانے پر حضرت حواؑ نے پہلے وہ پھل کھایا تھا جس کو کھانے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا تھا۔ تو جو ذات اللہ کے احکام سے مکر سکتی ہے وہ کسی اور کی فرماں بردار کیونکر ہو سکتی ہے۔؟

اس ضمن میں ایک اور اہم دلیل جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ آج تک کسی عورت کو منصب نبوت پر فائز نہیں کیا گیا۔ ایک مقام پر ارشاد باری ہوتا ہے۔

"ہم نے تمہارے درمیان ان لوگوں کو ہدایت کے لئے بھیجا جو کہ تم میں زیادہ فرمانبردار تھے"۔

چونکہ جتنے بھی پیغمبر یا نبی روئے زمین پر بھیجے گئے وہ سب مرد تھے لہٰذا اس سلسلے میں مزید کسی مبالغہ آرائی کی گنجائش نہیں کہ مرد (لڑکے) عورت (لڑکیوں) کے مقابلے میں زیادہ فرمانبردار ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا ارشاد باری کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کیونکہ جو ذات اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکامات پر پورا اترے، وہ اللہ کی مخلوق کی خواہشات کا بھی احترام کرتی ہے۔

اسلامی تاریخ میں ایک اہم واقعہ اس امر کی اور زیادہ وضاحت کر دیتا ہے کہ لڑکے والدین کے زیادہ فرمانبردار ہوتے ہیں۔ جب حضرت ابراہیمؑ کے محض ایک اشارے پر حضرت اسمٰعیلؑ اپنے والد محترم کے قدموں میں قربانی دینے کے لئے لیٹ گئے تھے۔ والدین کی فرمانبرداری کی اس سے بڑھ کر اور کوئی مثال ساری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

الغرض ان تمام دلائل کی روشنی میں ہم یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ لڑکے والدین کے زیادہ فرمانبردار اور سعادت مند ہوتے ہیں۔ ؎ صادق ہوں اپنے قول پر غالب، خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

تحریری مباحثے میں دوسرا انعام حاصل کرنے والی دو منتخب تحریریں آئندہ ماہ پڑھیے

یہ آپ کی کامیابی ہے

آپ نے ملک بھر میں سگریٹ نوشی کے خلاف تحریک چلائی
والدین اور بزرگوں کیلئے صحت اور درازیٔ عمر کی دُعائیں مانگیں اور
انہیں سگریٹ چھوڑنے کے لیے کہا۔
آپ نے سگریٹ نوشی کے خلاف آنکھ مچولی کے اسٹکرز در و دیوار
پر چسپاں کیئے ....

آپ کامیاب ہو گئے

ہماری سگریٹ چھڑاؤ تحریک کے بعد "پی آئی اے" نے اپنی فلائیٹس
میں سگریٹ نوشی کو ممنوع قرار دے دیا۔

یہ آپ کی پہلی کامیابی ہے۔

سگریٹ کے زہریلے دھوئیں کے خلاف

ہماری تحریک جاری ہے اس وقت تک

تحریک جاری رہے گی جب تک

وطنِ عزیز کی فضائیں سگریٹ کی زہریلی آلودگی سے
پاک نہیں ہو جاتیں

سُراغ

اعجاز احمد (ڈنگہ)

عارف کی سولہویں سالگرہ کو ابھی دو دن ہی گزرے تھے کہ ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں اُسے اپنے ابّو کی وفات کی خبر ملی۔ وہ اُس وقت دسویں جماعت میں تھا۔ وہ لاہور کے ایک بہترین اسکول میں زیرِ تعلیم تھا۔ اُس کی امّی بچپن میں ہی فوت ہوگئی تھیں۔ اُس کا اور کوئی بہن بھائی نہ تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ جب اُس کی امّی فوت ہوئیں تو اُس کے ابّو نے دوسری شادی نہ کی۔ اُس کے ابّو ایک پولیس آفیسر تھے۔ کبھی یہاں ہوتے کبھی وہاں۔ انہوں نے عارف کو ایک اچھے اسکول میں جس کا اپنا ہوسٹل بھی تھا داخل کرا دیا۔ اُس کے ابّو اُس سے بہت محبّت کرتے تھے۔ عارف ہی اُن کی کُل کائنات تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ عارف خوب پڑھے لکھے۔ وہ جہاں بھی ہوتے مہینے میں دو تین بار اُسے ضرور ملنے آتے۔ اور جب عارف کی اسکول سے چُھٹّیاں ہوتیں تو اُسے اپنے پاس لے جاتے۔ ابھی چند دن قبل ہی عارف اپنے ابّو کو اپنے آبائی گھر جو کہ لاہور سے ایک گھنٹے کی مسافت پر ایمن آباد میں تھا مل کر آیا تھا۔ اُس کے ابّو ریٹائر ہوچکے تھے۔ اور اب مستقل اپنے گھر میں ہی رہتے تھے۔ وہ بطورِ اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس بھرتی ہوئے تھے۔ اور اپنی محنت اور دیانتداری کے بل بُوتے پر سینیئر سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ چونکہ ایمن آباد میں کوئی اچھا اسکول نہ تھا۔ اس لئے ریٹائر

ہونے کے بعد بھی انہوں نے عارف کی رہائش لاہور ہوسٹل میں ہی رکھی۔ وہ شاید خود لاہور منتقل ہو جاتے لیکن ایک تو ایمن آباد کے نزدیک واقع اپنی زرعی زمینوں کی دیکھ بھال کے لئے اُن کا ایمن آباد رہنا ضروری تھا۔ دوسرے وہ شہر کے ہنگاموں سے دُور رہ کر اپنی یادداشتیں لکھ رہے تھے۔

عارف کو جب اس کے ابّو کی وفات کی خبر پہنچانے اُس کے ابّو کے دوست ایس پی ناصر اسکول پہنچے تو عارف کو یقین ہی نہ آیا۔ ایس پی ناصر عارف کے ابّو ریٹائرڈ ایس پی۔ باقر صاحب کے ماتحت رہ چکے تھے۔ اور وہ باقر صاحب کے اچھے دوست تھے۔ عارف اُنہیں انکل ناصر کہتا تھا۔ انکل ناصر باقر صاحب کی غیر حاضری میں عارف کا خیال رکھتے تھے۔ وہ اُن دنوں لاہور میں ہی متعین تھے۔

"لیکن انکل یہ کیسے ہُوا؟" عارف جب خوب رو چکا تو اُس نے سوال کیا۔ وہ اپنے ابّو ہی کی طرح ایک مضبوط اعصاب کا لڑکا تھا۔" آپ کہتے ہیں اُنہیں ہارٹ اٹیک ہُوا ہے اگرچہ وہ دل کے مریض تو تھے لیکن چند دن قبل وہ میو ہسپتال میں ہارٹ اسپیشلسٹ پروفیسر ڈاکٹر منیر صاحب سے معائنہ کروا کر گئے ہیں اور ڈاکٹر نے اُن کی حالت کو تسلی بخش قرار دیا تھا۔ انہوں نے خود مجھے فون پر بتایا تھا پھر یہ کیسے ہُوا؟" عارف نے انکل ناصر سے پوچھا

عارف جب انکل ناصر سے بات چیت کر رہا تھا تو ناصر صاحب نے عارف کی ذہین چمک دار آنکھوں کو دیکھتے ہوئے سوچا کہ عارف بھی اپنے ابّو کی طرح ذہین ہے۔

"ہاں بیٹے جیسا کہ تم جانتے ہو تمہارے ابّو دل کی تکلیف ہی کی وجہ سے پولیس کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ تمہارے گھریلو بوڑھے ملازم بشیر نے اُنہیں آج ساڑھے بارہ بجے اُن کے لکھنے کے کمرے میں فرش پر مُردہ پایا۔ جب اُنہیں دل کا دورہ پڑا تو وہ اپنی لکھنے کی میز پر بیٹھے اپنی کتاب لکھ رہے تھے۔ دورے کی حالت میں انہوں نے کُرسی سے اُٹھنے کی کوشش کی تو ساتھ کھڑی کتابوں کی الماری سے ٹکرا کر فرش پر گِرے۔ کتابوں کی الماری کے اوپر پڑا ہوا ایک برتن گرا اور وہ اُن کے سر پر لگا۔ اُن کے سر پر ہلکی سی ضرب کا نشان بھی ہے۔ یہ سب کچھ چند سیکنڈوں میں ہو گیا۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ موت دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی ہے۔"

عارف اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"انکل مجھے یقین نہیں آتا۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ ابّو ہارٹ اٹیک سے ہی فوت ہوئے ہیں۔ کیا انہیں کسی نے قتل تو نہیں کیا۔ کہیں وہ غیر طبعی موت سے ہمکنار تو نہیں ہوئے۔"

"بیٹے تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟" انکل ناصر نے پوچھا۔

"انکل میرے ابّو میرے دوست بھی تھے۔ وہ ہر بات مجھے بتایا کرتے تھے۔ اُن کی ڈیوٹی بہت خطرناک

تھی - انہوں نے کئی خطرناک مجرم قابو کیئے تھے - اُن کے بہت سے دشمن تھے - اُن کا کوئی دشمن بھی اُن کی جان لے سکتا تھا۔

"نہیں نہیں" ناصر صاحب نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا" میں نے ڈاکٹر سے فون پر بات کی تھی۔ اُنہیں یقین ہے کہ موت دل کے دورے سے ہی ہوئی ہے"۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ انہوں نے دو بار تفصیلی معائنہ کیا ہے۔ باقر صاحب کے جسم پر کسی زخم کا نشان نہیں۔ زہر خورانی کی کوئی نشانی نہیں۔ گلا گھونٹا جانے کا کوئی ثبوت نہیں اور دل کے دورے سے ہلاک ہونے کی تمام نشانیاں موجود تھیں۔

"ہو سکتا ہے انکل ڈاکٹر ٹھیک ہی کہتے ہوں لیکن ..." عارف کی آنکھوں میں آنسو آ گئے - انکل ناصر نے اُٹھ کر عارف کا کندھا تھپتھپایا اور کہا۔

"صبر کرو بیٹے - صبر، اور چلنے کی تیاری کرو"۔

اسکول کے گراؤنڈ میں ناصر صاحب کی گاڑی کھڑی تھی - ناصر صاحب کو کوئی ضروری کام تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ ایک گھنٹہ تک ایمن آباد پہنچ جائیں گے - انہوں نے اپنے ڈرائیور کے ہمراہ اپنی گاڑی میں عارف کو ایمن آباد بھجوادیا۔

ناصر صاحب کی گاڑی میں اُس دن کا اخبار پڑا تھا - عارف نے اپنا ذہن اپنے ابّو کی وفات سے ہٹانے کے لیئے اخبار کا مطالعہ شروع کر دیا۔ دوسرے صفحے پر چھپی ہوئی ایک تصویر نے عارف کی توجّہ اپنی طرف مبذول کروالی۔ اُس نے تصویر کے نیچے درج تفصیل پڑھی یہ ایک منشیّات کے کیس میں سزا پاکر رہائی حاصل کرنے والے مجُرم کی تصویر تھی۔ وہ مجرم تقریباً ایک ماہ قبل رہا ہُوا تھا۔ اُس مجُرم کا تعلق افغانستان اور پاکستان کے درمیان واقع قبائلی علاقے سے تھا۔ اُس کا نام بوستان تھا۔ اور اُن دنوں وہ لاہور کے ایک ہوٹل میں رہائش پذیر تھا۔ وہ گناہوں سے تائب ہو کر لاہور میں ہی کوئی کاروبار کرنا چاہتا تھا۔ عارف نے خبر میں چھپی ہوئی تفصیل بار بار پڑھی۔ وہ اُس آدمی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اُس وقت چھوٹا سا تھا جب وہ اپنے ابّو کے ساتھ ایک دن عدالت میں گیا تھا۔ اُس کے ابّو نے بوستان کے خلاف گواہی دی تھی۔ بوستان کو منشیّات اسمگل کرنے کے جُرم میں دس سال کی سزا ہوئی تھی۔ عارف کو یاد تھا کہ جب جج نے بوستان کو سزا سُنائی تھی تو اُس نے باقر صاحب کی طرف منہ کر کے اُنہیں دھمکی دی تھی کہ چونکہ انہوں نے اُسے سزا دلوائی ہے اِس لیئے وہ اُن سے بدلہ لے گا۔ عارف کو یاد تھا کہ بوستان نے رہا ہو کر اُس کے والد کو جان سے مار دینے کی دھمکی دی تھی - بوستان رہا ہو چکا تھا اور اُس کے ابّو فوت ہو گئے تھے - اگرچہ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اُس کے ابّو طبعی موت سے ہمکنار ہوئے تھے۔ لیکن عارف کو یقین نہیں آرہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ باقر صاحب کے کسی دشمن نے اُنہیں مارا ہے اور بوستان کی تصویر دیکھ کر عارف کا یقین اور پختہ ہو گیا کہ اُس کے ابّو

کی موت میں کسی نہ کسی طرح بوستان کا ہاتھ ہے۔

ایس۔پی ناصر صاحب عارف کے ابّو کی نمازِ جنازہ میں پہنچ گئے۔جب سب لوگ تجہیز و تکفین سے فارغ ہو گئے تو ناصر صاحب عارف کے ہمراہ اُن کے گھر گئے۔انہوں نے عارف کو دلاسا دیا اور کہا کہ اُسے صبر سے اور ہمت سے کام لینا چاہیے۔اپنی تعلیم کی طرف پوری توجّہ دینی چاہیے۔ناصر صاحب نے بتایا کہ عارف کے ابو عارف کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے تھے۔اس لئے عارف کا فرض ہے کہ وہ اپنے ابّو کی خواہش کی تکمیل کے لئے۔۔۔ اَن تھک محنت کرے۔ناصر صاحب نے یہ بھی کہا کہ وہ عارف کا پورا پورا خیال رکھیں گے۔عارف کو کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو وہ اُن سے کہے۔

"انکل فی الحال تو آپ میرے ابّو کی موت کا راز فاش کرنے میں میری مدد کریں" عارف نے کہا۔

"کیا مطلب بیٹے؟" ناصر صاحب نے حیرانگی سے پوچھا۔

"انکل میرا خیال ہے کہ میرے ابّو کو قتل کیا گیا ہے اور اُن کے قتل میں بوستان کا ہاتھ ہے"۔عارف نے کہا اور پھر اُس نے بوستان کی دھمکی کا ذکر بھی کیا۔

"نہیں بیٹے یہ تمہارا وہم ہے۔میں دو وجوہات کی بناء پر بوستان کو مجرم نہیں سمجھتا۔پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اکثر مُجرم پولیس ملازمین کو دھمکیاں دیتے ہی رہتے ہیں لیکن اُن دھمکیوں پر بہت ہی کم مُجرم عمل کرتے ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ آج بارہ بجے بوستان میرے دفتر میرے سامنے بیٹھا تھا۔وہ اپنی مجرمانہ زندگی سے تائب ہونے کی یقین دہانی کرا کر لاہور میں رہنے کی اجازت لینا چاہتا تھا۔اور تم جانتے ہو ڈاکٹروں نے تمہارے ابّو کی موت واقع ہونے کا وقت بھی بارہ بجے بتایا ہے۔ڈاکٹروں کو وقت کے تعیّن میں کوئی شبہ نہیں۔اس طرح بوستان ہر طرح کے شُبے سے بالاتر ہو جاتا ہے"۔

ناصر صاحب کی اس وضاحت کے بعد عارف کو مطمئن ہو جانا چاہیئے تھا۔لیکن اگرچہ اُس نے ناصر صاحب سے مزید بحث نہ کی لیکن اُس کی عقل یہ باور کرنے کو تیار نہ تھی کہ اُس کے ابّو ہارٹ اٹیک سے مر سکتے ہیں۔ناصر صاحب اُسے پُرسکون رہنے کی ہدایت دینے کے بعد لاہور روانہ ہو گئے۔

تین چار دن گھر میں مہمان اکٹھے رہے۔اپنی امّی اور ابّو کی وفات کے بعد عارف گھر میں تنہا رہ گیا تھا۔ اُس کے پاس بوڑھا جانثار ملازم بشیر ہی رہ گیا تھا۔اُس کے چند رشتہ داروں نے اُسے اپنے ساتھ لے جانے کی پیشکش کی۔لیکن اُس نے اپنا گھر چھوڑنے سے انکار کر دیا۔اُس کے ابّو ساری عمر اُسے خود اعتمادی کا درس دیتے رہے تھے۔وہ کسی رشتہ دار کے ہاں جاتا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اُسے اپنی ذات پر اعتماد نہیں۔

جب گھر میں سوگواروں کا ہجوم کم ہُوا تو اُس نے بوڑھے بشیر کو کہا کہ وہ اُس دن کے واقعات پوری تفصیل سے بیان کرے جس دن اُس کے پیارے ابّو فوت ہوئے تھے۔ اُس نے بشیر کو کہا کہ وہ کوئی معمولی بات بھی نہ چھُپائے۔ بشیر نے اُسے بتایا کہ اُس کے ابّو کا معمول تھا کہ وہ صبح ناشتے کے بعد اپنی فصلوں کا چکّر لگاتے۔ اور پھر دس بجے صبح سے لے کر دو بجے دوپہر تک اپنی یادداشتوں پر مشتمل کتاب لکھنے بیٹھ جاتے۔ انہوں نے اس معمول میں کبھی ناغہ نہ کیا۔ وہ ٹائم ٹیبل کے پابند انسان تھے۔ جس دن وہ فوت ہوئے اُس دن تقریباً دس بجے اُن سے ایک ملاقاتی ملنے آیا۔ وہ ملاقاتی ایک گھنٹہ اُن کے پاس اُن کے لکھنے کے کمرے میں ہی بیٹھا رہا۔ گیارہ بجے وہ چلا گیا۔ بشیر نے بتایا کہ وہ ساڑھے بارہ بجے کسی کام سے باقر صاحب کے لکھنے کے کمرے میں گیا تو اُس نے دیکھا کہ وہ کمرے کے فرش پر گرے پڑے تھے۔ اُس نے اُن کی نبض دیکھی وہ ساکت تھی۔ اُس نے خود سرکاری ہسپتال کے ڈاکٹر کو فون کیا۔ ڈاکٹر فوراً پہنچا۔ اُس نے اُن کی موت کی تصدیق کی۔ ہسپتال سے مزید ڈاکٹر بھی آئے انہوں نے لاش کے تفصیلی معائنے کے بعد موت کا سبب دل کا دورہ بتایا۔ بشیر نے مزید بیان کیا کہ لاش کی حالت دیکھنے کے بعد سب کا خیال ہے کہ جب وہ کُرسی پر بیٹھے لکھ رہے تھے تو اُنہیں دل میں درد کا احساس ہُوا۔ وہ گھبرا کر کُرسی سے اُٹھے لیکن پاس پڑی ہوئی کتابوں کی الماری سے ٹکرا کر فرش پر گرے۔ الماری پر ایک بھاری کانسی کا جگ پڑا ہُوا تھا۔ الماری کے ہلنے سے وہ جگ گِرا اور اُن کے سر پر لگا۔ بشیر اور عارف دونوں جانتے تھے کہ وہ جگ نما برتن ان کے ایک مرحوم دوست نے انہیں تحفہ دیا تھا۔ اُن کے دوست ماہرِ آثارِ قدیمہ تھے۔ وہ برتن کسی کھدائی میں ملا تھا۔ باقر صاحب کو اپنے دوست کا دیا ہُوا وہ تحفہ بہت پسند تھا۔ وہ اُسے ہر وقت اپنی نظروں کے سامنے رکھتے تھے۔ وہ برتن انہوں نے کتابوں کی الماری کے اوپر رکھا ہُوا تھا۔

ایک ملاقاتی کے ذکر پر عارف چونکا۔

"اُس دن کس قسم کا ملاقاتی آیا تھا؟" عارف نے بابا بشیر سے پوچھا۔

"پتہ نہیں کون تھا۔ شاید کوئی قبائلی تھا۔ صاحب بڑی گرمجوشی سے ملے تھے" بشیر نے جواب دیا۔

قبائلی کے ذکر پر عارف اُٹھ کر اخبار اُٹھا لایا۔ وہ اخبار ناصر صاحب کی گاڑی سے ہمراہ ہی لے آیا تھا۔

"بابا ملاقاتی یہ شخص تو نہیں تھا؟" عارف نے بابا بشیر کو بوستان کی اخبار میں چھپی ہوئی فوٹو دکھاتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل یہی شخص تھا بیٹے" بابا نے فوٹو دیکھتے ہی کہا۔

اچھا تو بوستان اُس دن ابّو سے ملنے بھی آیا تھا۔ اور جب وہ گیا تو ابّو ہلاک ہو گئے۔ اور ابّو اُس وقت اللہ کو پیارے ہوئے جب بوستان انکل ناصر کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ عارف اپنے دل میں سوچنے لگا۔

اگر بوستان نے ابّو کو ہلاک کیا ہے تو اُس نے کون سا طریقہ استعمال کیا ہوگا؟ عارف اپنے ذہن میں سوچنے لگا۔ اور یہی سوچتے سوچتے اُس نے شریف بابا سے ایک سوال اور کیا۔

"بابا کوئی اور بات۔ کوئی معمولی سے معمولی بات جو آج کے حادثہ کے متعلق ہو۔"

"بیٹا ایک چھوٹی سی بات ہے تو سہی۔ لیکن وہ بات شاید اتنی اہم نہ ہو۔" بشیر بابا نے کہا۔

"نہیں بابا وہ بات بھی ضرور بتاؤ خواہ وہ بات کتنی ہی غیر اہم کیوں نہ ہو۔" عارف نے کہا۔

"بیٹا جب میں نے صاحب کے پاس پڑا ہوا برتن اُٹھایا تو میں نے دیکھا کہ برتن کے قریب قالین کا تھوڑا سا حصّہ گیلا تھا۔ میں اُس وقت سے حیران ہوں کہ قالین کا وہ حصّہ گیلا کیسے ہوگیا حالانکہ برتن میں کبھی پانی نہیں ڈالا گیا تھا۔" بابا بشیر نے جواب دیا۔

"بابا قالین کہاں سے گیلا تھا۔" عارف نے پوچھا۔

"بیٹے یہاں سے قالین گیلا تھا۔" بابا بشیر نے اُٹھ کر قالین کے اُس حصّے کی نشاندہی کی۔

عارف نے اُٹھ کر قالین کے اُس حصے کا جائزہ لیا۔ اُس نے سوچا کہ اُس کے والد سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ لاپرواہی سے قالین پر پانی گراتے۔ جس حصّے کی بابا نے نشاندہی کی تھی وہ جگہ اُسی صورت میں گیلی ہوسکتی تھی جب کہ الماری کے اوپر سے پانی ٹپکایا جاتا۔

لیکن کسی کو کتابوں والی الماری کے اوپر سے پانی ٹپکانے کی کیا ضرورت تھی؟

عارف نے اپنی نگاہیں الماری کی طرف مرکوز کردیں۔ الماری کے اگلے کونے پر جگ اُس وقت بھی پڑا تھا۔ اور پھر اچانک ایک خیال عارف کے ذہن میں کوندا۔

"بابا۔ ابّو نے مہمان کی تواضع کس چیز سے کی تھی۔" عارف نے پوچھا۔

"بیٹا گرمیوں کے موسم میں صاحب شربت خوب پیتے تھے اور خوب ٹھنڈا کر کے پیتے تھے۔ برف کی بڑی بڑی ڈلیاں ملا کر پیتے تھے۔ اور آنے والوں کی تواضع بھی وہ اُسی ٹھنڈے مشروب سے کرتے تھے۔ اُس دن جب مہمان آیا تو صاحب نے مجھے خوب ٹھنڈے شربت کا جگ بھر کر لانے کو کہا۔" بابا نے جواب دیا۔

"بابا جب مہمان آیا تو کچھ دیر کے لئے ابّو کمرے سے باہر بھی نکلے تھے؟"

"ہاں بیٹے میرے خیال میں کسی کاغذ کو تلاش کرنے کے لئے وہ اپنے بیڈ روم کی طرف گئے تھے اور مہمان اُس وقت لکھنے کے کمرے میں اکیلا بیٹھا رہا تھا۔" بابا نے عارف کے اندازے کی تصدیق کردی۔

عارف کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "بس ٹھیک ہے بابا میں سمجھ گیا۔"

"کیا سمجھ گئے بیٹے ۔ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ؟"

"ابھی نہیں بابا ۔ کچھ دن اور انتظار کر لو"

عارف نے اُسی وقت اُٹھ کر فون پر اپنے انکل ایس ۔ پی ناصر صاحب سے رابطہ قائم کیا۔

"انکل میں نے اپنے ابو کے قتل کا معمہ حل کر لیا ہے" عارف نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بیٹے تمہارے ابو طبعی موت سے ہمکنار ہوئے ہیں ۔ تم صبر سے کام لو اور خواہ مخواہ اُن کی موت کو قتل کی واردات ثابت کرنے کی کوشش ترک کر دو" ناصر صاحب نے عارف کو پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"پلیز انکل آپ میری بات پر یقین کریں ۔ میرے ابو کو قتل کیا گیا ہے ۔ قاتل نے پوری منصوبہ بندی سے اپنی طرف سے مکمل قتل کا ارتکاب کیا ہے ۔ قاتل کا خیال تھا کہ اُس کے طریقۂ قتل کو کوئی جان نہیں سکے گا، لیکن میں سب کچھ جان گیا ہوں"

"اچھا تو بتاؤ قاتل کون ہے اور اُس نے کس طریقے سے واردات کی ہے" ناصر صاحب نے پوچھا۔

"نہیں انکل آپ یہاں آئیں میں ابو کے سٹڈی روم میں ہی جہاں اُنہیں قتل کیا گیا ہے ۔ آپ کو قتل کی واردات کا طریقہ سمجھا سکوں گا"

"ٹھیک ہے میں کل دس بجے صبح تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا" ناصر صاحب نے عارف کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن ٹھیک دس بجے ناصر صاحب عارف کے پاس پہنچ گئے تو عارف انہیں لے کر اپنے ابو کے سٹڈی روم میں پہنچا ۔ عارف نے ضد کر کے ناصر صاحب کو اُسی مخصوص کرسی پر بٹھایا جس کرسی پر وہ میز کے سامنے بیٹھ کر اپنی کتاب کے لئے اپنی یادداشتیں لکھا کرتے تھے ۔ ناصر صاحب کے آنے سے چند منٹ قبل وہ اپنی تھیوری کو ثابت کرنے کے لئے اسٹڈی روم میں انتظامات مکمل کر چکا تھا۔

"ہاں تو بیٹے بتاؤ کہ تمہارے ابو کا قاتل کون ہے؟" ناصر صاحب نے بیٹھتے ہی سوال کیا۔

"انکل آپ تھوڑی دیر بیٹھیں تو سہی ۔ میں ابھی سب کچھ عرض کرتا ہوں"

اور پھر عارف نے ناصر صاحب اور اپنے ابو باقر صاحب کی دوستی کا ذکر چھیڑ دیا ۔ دونوں دوستوں نے مشترکہ مُہموں کے دوران جن خطرناک مجرموں کو قابو کیا تھا ۔ اُن کا تذکرہ شروع کر دیا اور ناصر صاحب اُس ذکر میں اس طرح محو ہوئے کہ اُنہیں ایک گھنٹہ گزرنے کا احساس بھی نہ ہُوا ۔ عارف ناصر صاحب کے سامنے کی کرسی پر بیٹھا ہُوا تھا ۔ وہ ناصر صاحب سے باتیں کرتے ہوئے گاہے گاہے ناصر صاحب کی کرسی کے پیچھے ایستادہ کتابوں کی الماری اور الماری کے اوپر رکھے ہوئے

کانسی کے برتن پر نظر ڈال لیتا۔ اور دوبارہ گفتگو میں شریک ہوجاتا۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد وہ تیزی سے اپنی کرسی سے اُٹھا اور ناصر صاحب کی طرف پہنچ کر اُس نے ناصر صاحب کی کرسی کو دھکیل کر ایک طرف کرتے ہوئے چلا کر کہا۔

"انکل بچیئے"

اور عین اُس وقت کتابوں کی الماری کے اُوپر رکھا ہُوا کانسی کا بھاری برتن ایک دھماکے سے زمین پر گرا اور ناصر صاحب عین وقت پر ایک طرف نہ ہوجاتے تو کانسی کا بھاری برتن ناصر صاحب کے سر پر لگتا اور وہ زخمی ہوجاتے۔

"یہ ... یہ کیا ہُوا ہے؟" ناصر صاحب نے اپنی کرسی سے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

"انکل اس طریقے سے میرے ابّو کو قتل کیا گیا ہے" ناصر نے ادب سے جواب دیا۔

"بیٹے وضاحت کرو"

"آپ اپنے پیچھے الماری کی طرف دیکھئے انکل۔ الماری کا اُوپر کا تختہ آگے کو نکلا ہُوا ہے۔ اُس تختے پر رکھا ہوا کانسی کا برتن کرسی کے عین اُوپر ہے۔ اگر یہ برتن گرے تو کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کے عین سر پر گرتا ہے اور کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کو لازمی طور پر زخمی کرتا ہے۔ اگر کرسی پر بیٹھا ہُوا شخص دِل کا مریض بھی ہو تو برتن کے گرنے سے پیدا ہونے والا شور اور برتن لگنے سے آنے والا زخم دِل کے مریض کے لئے مہلک بھی ہو سکتا ہے۔ میرے ابّو کے قاتل کو صرف ایسا طریقہ ڈھونڈنا تھا کہ یہ برتن گر پڑے اور اُس وقت گرے جب قاتل کمرے میں موجود نہ ہو۔ قاتل کو وہ موقع خود ابّو نے مہیا کر دیا تھا۔ انکل میرے ابّو کا قاتل بوستان ہے۔ وہ جب تک جیل میں رہا ابّو سے انتقام لینے کا منصوبہ بناتا رہا۔ جیل سے رہا ہو کر اُس نے ابّو کے متعلق کوائف اکٹھے کئے۔ وہ ابّو کی عادات سے واقف ہُوا۔ وہ ابّو سے ملنے آیا۔ آپ کی طرح اُس نے ابّو کو بھی جرائم کی دُنیا سے تائب ہونے کی بات سُنائی ہوگی۔ ابّو یقیناً خوش ہوئے ہوں گے۔ وہ ایک سے زائد بار ابّو کے اسٹڈی روم میں آیا ہوگا۔ وہ ابّو کے معمولات سے آگاہ ہُوا ہوگا۔ کتابوں کی الماری کو اُس نے دیکھا ہوگا۔ الماری کے اُوپر پڑا ہُوا کانسی کا بھاری برتن اُس کی نظروں میں آیا ہوگا۔ اُس نے کسی طریقے سے برتن ابّو کے سر پر گرانے کی منصوبہ بندی کی ہوگی۔ اور جس طرح میں برتن گرانے میں کامیاب ہُوا ہوں اِسی طرح وہ بھی کامیاب ہُوا ہوگا۔ کانسی کا جگ ابّو کے سَر پر لگا ہوگا۔ ابّو لڑکھڑا کر زمین پر گرے ہوں گے۔ اور اس اچانک حادثے سے اُن پر دِل کا زبردست دورہ پڑا ہوگا اور اُن کی رُوح جسم سے جُدا ہوگئی ہوگی۔ بابا بشیر نے اور ڈاکٹر حضرات نے ابّو کے جسم اور جگ کو قالین پر پڑے پایا تو انہوں نے سمجھا کہ وہ کرسی سے گر کر الماری سے ٹکرائے تو برتن نیچے گرا۔ جب کہ اصل میں برتن پہلے گرا۔ اُن کا سر زخمی ہُوا۔ زخمی ہونے کے بعد اُن پر دِل کا دورہ پڑا اور وہ کرسی سے نیچے گرے اور برتن بھی لُڑھک کر اُن کے پاس گرا۔" عارف نے حادثے کی پُوری تفصیل بیان کی۔

"لیکن بیٹے کانسی کا برتن خود بخود کیسے گرا۔ جب حادثہ ہُوا یعنی برتن گرا اُس وقت تو بوستان میرے دفتر میں میرے پاس بیٹھا تھا۔" ناصر صاحب نے پوچھا۔

"یہی تو راز کی بات ہے انکل کہ برتن خود بخود کیسے گرا۔ ابّو شربت خوب ٹھنڈا کر کے پینے کے عادی تھے۔ وہ شربت میں برف کی بڑی بڑی قاشیں ملا کر شربت پیا کرتے تھے۔ حادثے کے دن جب بوستان انہیں ملنے آیا تو انہوں نے برف کی قاشیں ملا کر شربت اُسے پیش کیا۔ وہ کسی کام سے اُٹھ کر کمرے سے باہر نکلے تو بوستان نے شربت سے برف کی ایک بڑی ڈلی نکالی اور جگ کو الماری سے تھوڑا آگے کھسکا کر برف کی ڈلی برتن کے نیچے اس طرح رکھ دی کہ جب وہ پگھل جائے تو کانسی کے برتن کا توازن برقرار نہ رہے۔ بوستان جانتا تھا کہ برف کے پگھلنے کے بعد برتن غیر متوازن ہو کر ابّو کے سر پر لگے گا اور دِل کے مریض ہونے کی وجہ سے یہ حادثہ اُن کے لئے جان لیوا ہوگا۔ بدقسمتی سے بوستان کا منصوبہ مکمل طور پر کامیاب رہا۔ ابّو سے مِل کر بوستان آپ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ گیارہ بجے ابّو سے جُدا ہُوا اور بارہ بجے سے چند منٹ قبل آپ کے پاس پہنچ گیا۔ اس طرح موقعٔ واردات پر اُس نے اپنے موجود نہ ہونے کا مکمل ثبوت دے دیا۔ ادھر بوستان آپ کے پاس پہنچا اُدھر برف پگھلتی رہی اور قطرہ قطرہ پانی نیچے قالین میں گر کر جذب ہوتا رہا۔ اور ٹھیک بارہ بجے برف بالکل پگھل گئی۔ اور کانسی کا برتن گر پڑا۔ ابّو لکھنے میں اتنے محو تھے کہ وہ کانسی کے برتن کے نیچے رکھے ہوئے برف کے ٹکڑے اور پانی کے قطروں کے گرنے کی طرف دھیان نہ دے سکے۔" عارف نے اپنے خیال کی مزید تشریح کی۔

"شاباش بیٹے۔ لیکن تمہیں برتن کے نیچے برف کا ٹکڑا رکھنے کی سازش کا علم کیسے ہُوا؟" ناصر صاحب نے پوچھا

"جب بابا بشیر نے بتایا کہ برتن کے پاس قالین کا تھوڑا سا ٹکڑا گیلا تھا۔ اور جب اُس نے بتایا کہ اُس دن ابّو نے مہمان کی ٹھنڈے مشروب سے تواضع کی تھی۔ تو میں سمجھ گیا کہ واردات کیسے ہوئی۔"

"بہت اچھے بیٹے تم بے شک ایک ذہین باپ کے عقل مند بیٹے ہو۔ تم نے ایک پیچیدہ کیس کو حل کیا ہے۔ اب مجھے اجازت دو تاکہ میں جا کر بوستان کو گرفتار کر کے کیس مکمل کروں۔"

ناصر صاحب عارف کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے باہر نکل گئے۔ ناصر مطمئن تھا کہ اُس کے ابّو کا قاتل اب قانون کے پنجے سے نہیں بچ سکے گا۔

ننھی نگارشات

نوخیز قلم کاروں کی مختصر تحریروں سے انتخاب

ایک ضروری بات

ادارہ آنکھ مچولی نے بار ہا اپنے لکھنے والوں سے درخواست کی ہے کہ وہ نقل شدہ تحریروں کے بجائے ہمیں اپنی ذاتی تحریریں بھجوائیں۔ خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں، لیکن بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود بھی بعض ساتھی ہمیں دوسروں کی تحریریں اپنے نام سے بھجوا دیتے ہیں۔ ایسا کرنا بد دیانتی بھی ہے اور تکلیف دہ عمل بھی۔ نقل شدہ تحریریں بھجوانے کے اس منفی رجحان کو روکنے کے لیے ہم اپنے قارئین ساتھیوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ تمام تحریریں بغور پڑھیں اور اگر چوری کی ہوئی یا نقل شدہ کوئی تحریر دیکھیں تو براہِ کرم فوراً اس کی نشاندہی کریں۔ چوری کی تحریریں بھجوانے والوں کے لیے ہمیں مجبوراً "بلیک بکس" کا ایک سلسلہ شروع کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ گویا ایک چھوٹی سی سزا ہے۔ جو ساتھی بھی ہمیں نقل شدہ تحریر بھجوائے گا ہم اس کا نام اور پتہ "بلیک بکس" میں شائع کیا کریں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ "آنکھ مچولی" میں آئندہ ان کے نام سے کبھی کوئی تحریر شائع نہ ہو سکے گی۔ (بلیک بکس "ننھی نگارشات" کے آخری صفحے پر دیکھیے۔)

حمد باری تعالیٰ

مرسلہ: فضلِ ربی راھی۔ منگورہ

واحد ہے ذات تیری
اعلیٰ ہے بات تیری

ہر شے کا تو ہے خالق
دن اور رات تیری

تجھ سا نہیں ہے کوئی
افضل ہے ذات تیری

سب کا ہے تو محافظ
سب کی حیات تیری

تو ہے جہاں سے بہتر
یارب تو سب کا رہبر

بلا عنوان

رقیہ آرزو...... کوئٹہ

یہ ایک تاریک شب تھی۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ چاند ستاروں کے ساتھ مل کر زمین پر ہلکی ہلکی روشنی بکھیر رہا تھا۔ رات کافی سرد تھی۔ اس لئے تمام لوگ یا تو اپنے بستروں پر سو چکے تھے یا پھر لحافوں میں دبکے نیند کا انتظار کر رہے تھے۔

ایسے میں زمین پر کچھ سائے بے چینی سے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ اور ان کے قریب ہی ہلکی موٹروں سے چلنے والے چار ہینگ گلائیڈر موجود تھے۔ ہینگ گلائیڈر راڈار سے پوشیدہ رہنے والی ایک ایسی چھوٹی جہاز نما چیز ہوتی ہے جس کے ذریعے ایک آدمی بآسانی اڑ کر سفر کر سکتا ہے۔

ابو علی نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا "اپنا اپنا سامان لے کر اپنے گلائیڈرز پر سوار ہو جاؤ۔ ہماری مہم کا وقت آن پہنچا ہے۔"

اور پھر اگلے ہی لمحے چار سائے گلائیڈروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔

...... O ......

یہ فلسطینی مجاہدوں کے ایک کیمپ کا منظر تھا۔ جو اپنی سرزمین اور مسلمانوں کے قبلہ اوّل "بیت المقدّس" کو یہودیوں کے ناجائز قبضہ سے آزاد کروانے کے لئے یہودیوں کے خلاف مصروف جہاد تھے۔ ٹھیک ۱۱ بجے ابو علی کی قیادت میں چار نوجوانوں پر مشتمل یہ چھاپہ مار ٹیم پیر اور منگل کے درمیانی شب اپنے مشن پر روانہ ہوئی۔ ٹیم میں ابو علی کے علاوہ ابو ثائر، ابو رامی اور ابو احسن بھی شامل تھے۔ جذبہ جہاد

سے سرشار یہ مجاہد ہوا کی تیز و تند لہروں سے ٹکراتے ہوئے زمین سے تین ہزار فٹ کی بلندی پر اپنے ٹارگٹ "اسرائیلی چھاؤنی" کی طرف اڑتے چلے آرہے تھے ان کا یہ سفر ایک خواب کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ ابو علی کی نظروں کے سامنے پچھلے واقعات تیزی سے دوڑنے لگے۔ جب وحشی اسرائیلیوں نے ٹینکوں اور جنگی جہازوں کے ذریعے ان کے کیمپ پر حملہ کر کے اس کے مظلوم رشتہ داروں اور عزیز و اقارب کو بُری طرح زخمی کر دیا تھا۔ اسی حملے کے دوران اس کے چار بے گناہ رشتہ دار بھی شہید ہو گئے تھے۔ اور اس حملے کے بعد ساری بستی اجڑ کر کسی کھنڈر کا تاثر دے رہی تھی۔

دوسری طرف اس کا ساتھی ابو رامی سوچ رہا تھا کہ آخر ان کا قصور کیا ہے؟ شاید یہ کہ وہ مسلمان ہیں۔ اور انہوں نے کفر کو قبول کرنے اور اس کے سامنے سر جھکانے سے انکار کیا ہے۔

ابو احسن ان سب سے دور تاریخ کے ان اوراق میں جھانک رہا تھا۔ جب ایک کفار نے ایک دفعہ سازش کے ذریعے مسلمانوں کے قبلہ اوّل پر قبضہ جما لیا تھا۔ اور مسلمانوں پر ظلم اور جبر کی انتہا کر دی۔ مگر پھر صلاح الدین ایوبیؒ نے نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے اپنے جانثار اور جاں فروش مجاہدوں کے جذبوں اور اللہ کے فضل و کرم سے دشمنوں کو عبرت ناک شکست دی

تھی)۔ مگر آج پھر دشمن مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر خود ان پر حکمران بن بیٹھا ہے۔

ابو ثائر سب سے جدا انداز میں آنے والے لمحات کے بارے میں سوچ کر جذبات کو مزید گرما رہا تھا۔ دشمن اگر طاقتور ہے۔ تو کیا ہوا؟ ہمارا محافظ ہمارا نگہبان خدا تو سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ اسی کیفیت میں وہ دشمن کے پانچ چھ راڈاروں کی حدود میں سے گزرے، مگر کوئی بھی سراغ نہ لگا سکا۔ اب مطلوبہ ہدف مجاہدوں کی نظروں کے سامنے تھا۔ اسرائیلی کیمپ میں دشمن فوجی گہری نیند سو رہے تھے۔

...... ○ ......

چند لمحوں بعد چاروں مجاہدین خشک جھاڑیوں میں اتر چکے تھے۔ اور رینگتے ہوئے اسرائیلی کیمپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کا منصوبہ تھا کہ دو، دو کی ٹولیوں میں کاروائی کی جائے۔ ایک ٹولی کیمپ میں اندر داخل ہو اور دوسری پیچھے رہ کر ان کی مدد کرے۔

چنانچہ ابو احسن اور ابو رامی نے حملہ کر دیا اور دوسرے دو ابو ثائر اور ابو علی دفاعی فائرنگ کرتے رہے۔ ان کے پاس کلاشن کوف اور ہینڈ گرینڈ تھے۔ جو ایک ہزار یہودیوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے کافی تھے۔ اسی اثناء میں ابو احسن اور ابو رامی نے فائر کھول دیا۔ اسرائیلی جاگ گئے تھے۔ اور شش و پنج میں مبتلا تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اسی دوران ابو ثائر کا پھینکا ہوا گرینڈ ایک بہت بڑے آئل ٹینکر پر جالگا۔ اور ہر طرف آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔

دوسری طرف کیمپ کے اندر لاتعداد اسرائیلی فوجی ابو احسن اور ابو رامی کی گولیوں کا نشانہ بن بن کر زمین پر گر کر تڑپ رہے تھے۔ کمانڈو ایکشن مکمل ہو چکا تھا۔

ابو علی نے اپنے مجاہدوں کو واپسی کا حکم دیا۔ ان میں ابو رامی اسرائیلیوں کے فائرنگ سے زخمی ہو چکا تھا۔ اسے بھی ایک گلائیڈز پر سوار کرایا گیا اور باقی لوگ بھی اپنے اپنے گلائیڈروں پر سوار ہونے لگے۔

ابو علی کا گلائیڈز سب سے آخر میں اڑا۔ ابھی وہ سو فٹ کی بلندی پر تھا۔ کہ اسرائیلی فوجوں نے اسے دیکھ لیا اور فائرنگ شروع کر دی۔ جس سے وہ شدید زخمی ہو گیا۔ اور مجبوراً لبنانی سرحد کے پار اتر گیا۔ اس کے باقی ساتھی بخیریت واپس چلے گئے تھے۔ اسرائیلی ہیلی کاپٹر تمام رات ابو علی کے گرد چکر کاٹتا رہا۔ اور جب صبح کے وقت اسرائیلی زمینی دستے وہاں پہنچے تو ابو علی شہید ہو چکا تھا۔

ابو علی کا بہا ہوا خون قبلہ اوّل اور فلسطین کی آزادی کی نوید سنا رہا تھا۔

اسکول بس

مونا ظفر خان زادہ حیدر آباد

جب سے ہمیں سننے کی صلاحیت میسر آئی ہے اس وقت سے ایک بات جو ہم مسلسل سن رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم "چاند کا ٹکڑا" ہیں۔ یہ بات آج بھی ہمیں بہت اچھی لگتی ہے مگر بقول ہماری ہم عمر سہیلیوں کے کہ یہ ہمارے والدین کی محبت ہے ورنہ .... (ورنہ ہم تو شاید چاند سے زیادہ خوب صورت ہیں) لیکن یہ باتیں اس وقت کی ہیں جب تک ہم نے اسکول بس میں سفر کا آغاز نہیں کیا تھا۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہئے اسکول کے لئے بس میں سوار ہونے سے

پہلے ہم اور ہم جیسے دوسرے چاند جیسے بچے جنھیں ان کی مائیں خوب بنا سنوار کے اسکول کے لئے روانہ کرتی ہیں اگر اسکول پہنچنے کے بعد انہیں دیکھ لیں تو شاید پہچان بھی نہ پائیں۔

ہمارے بس میں اتنا ہے کہ ہم بس میں بیٹھ جائیں، پھر تو ہم بس کے بس میں ہوجاتے ہیں۔ احوال اس بس کا یہ ہے کہ دوسری بسوں میں دھواں صرف سائیلینسر سے نکلتا ہو گا لیکن ہماری بس سے جیسی دھواں دھار فضا باہر ہوتی ہے ویسی ہی بس کے اندر ہوتی ہے ...... ایک بار جب اس بس نے بطور احسان ہمیں اسکول سے پہلے ہی اتار دیا تو دوراہ گیر جو آپس میں باتیں کرتے چلے جا رہے تھے رک کر غور سے ہمیں دیکھنے لگے اور ایک دوسرے سے یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ یار کیا زمانہ آگیا ہے۔ اب اسکول یونی فارم بھی کالے ہونے لگے ہیں۔

ہماری بس میں اور دوسری بسوں میں اگر کوئی مماثلت ہے تو اتنی کہ انہیں بھی لوگ بس کہتے ہیں اور صاحب یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ مارتے کا ہاتھ تو ہر کوئی پکڑ سکتا ہے مگر بولتے کی زبان کو کوئی نہیں پکڑ سکتا۔

سنتے ہیں دیگر سواریوں میں ہٹانے ولے کمانیوں، سائیلینسر اور ہارن وغیرہ کا تکلف بھی کرتے ہیں۔ الحمد اللہ کہ ہماری بس ان فضولیات سے پاک ہے۔ اللہ بخشے مرزا عظیم بیگ چغتائی کے زمانے کی جدید سواریوں مثلاً کھڑیا "یکہ" وغیرہ میں کمانیاں نہیں ہوتی تھیں۔ شاید یہی کھڑیا یکہ ہماری بس کا جدامجد ہے۔

رہا ہارن تو اس کی عدم موجوگی کی وجہ کنڈیکٹر نے یہ بتائی کہ اتنی بھانت بھانت کی آوازوں میں جو ہماری بس کے چلنے سے پیدا ہوتی ہیں ہارن کا وجود اضافی ہے۔

اسکول بس میں ان باتوں کے علاوہ مسافروں کی تواضع کے لئے دیگر سامان بھی موجود ہیں مثلاً دل بہلانے کے لئے نہایت مفید باتیں، اقوال زریں اور خبردایاں جو کچھ اس قسم کی ہوتی ہیں مسافر اپنے سامان کا خود ذمے دار ہو گا، اور طالب علموں کو موسم کے حال سے ہر وقت باخبر رکھنے کے لئے نہ بند ہونے والی کھڑکیاں وغیرہ۔

"چلتی کا نام گاڑی" یہ محاورہ اسی بس میں بیٹھ کر سمجھ میں آسکتا ہے جس پر ہمیں اسکول لانے اور لے جانے کا الزام ہے ورنہ بقول ہماری ایک بس فیلو کے کہ یہ صرف ہمارے عقیدے کی قوت ہے جو اس بس کو ہمارے اسکول تک گھسیٹ کر لے جاتی ہے۔

اب آپ خود سوچیں کہ اس بس کے سفر میں ہمارا یہ شہابی رنگ، سانولے سلونے بلکہ کالے رنگ سے بدل جائے تو کیا عجب ہے۔

مگر جناب داد دیجئے ہماری والداؤں کی محبتوں کو کہ جب ان کے بچے اس حال میں گھر لوٹتے ہیں تو وہ بقول پطرس "جی کڑا کر کے کہتی ہیں کہ آگیا میرا چاند۔"

بوجھو تو جانیں

سلمان نقی ...... کراچی

۱۔ وہ کونسا لباس ہے جو آدمی خود تیار کروا کر پہن نہیں سکتا۔؟

۲۔ دو اور دو میں کیا نکالا جائے کہ جواب بائیس آئے۔؟

۳۔ ۱۲۳۴۵۶۷۸۹ کو کس ہندسے سے ضرب

دیں کہ جواب بھی اسی ہندسے میں آئے۔ ؟

۴۔ دیکھنے میں وہ بڑھنے والی چیز ہے مگر اصل میں گھٹتی ہے انسان کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے۔ ؟

۵۔ گھڑی کی سوئی ۲۴ گھنٹوں میں کتنی مرتبہ اوپر نیچے آتی ہے۔ ؟

جواب:۔

۱۔ کفن ۲۔ لفظ اور

۳۔ صفر ۴۔ عمر

۵۔ ۲۲ مرتبہ

سچّی عید

اسماء رانی بدر عثمانیہ کالونی کراچی

"شازیہ...... شازیہ بیٹی! کچھ ہوش ہے تمہیں عید سر پر آچکی ہے کیا اس بار کپڑے نہیں بنانے؟" شازیہ کی امی نے آکر شازیہ سے کہا، جو کمرے میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔

"ممّی! اتنے سارے نئے کپڑے رکھے ہیں انہی میں سے کوئی پہن لونگی۔" احمق ہو تم! یہ لو پیسے اور ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ" انہوں نے پرس کھول کر تقریباً ڈیڑھ دو ہزار روپے شازیہ کو تھما دیئے "جاؤ اور اچھے سے کپڑے خرید لو میں بھی تمہارے ساتھ چلتی مگر مجھے اس وقت اپنی ایک دوست کے ہاں جانا ہے تم چلو گی"

"ممّی آپ جائیں مجھے یہ کتاب پڑھنی ہے"

"اچھا بیٹا میں چلی تم کتاب پڑھ کر ڈرائیور کے ساتھ چلی جانا۔" وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکلی ہی تھیں کہ انہیں ان کے ملازم کریم نے مخاطب کیا "بیگم صاحبہ"

"کیابات ہے؟" وہ رک گئیں "جی وہ میرے بیٹے کی طبیعت بہت خراب ہے"

"پھر میں کیا کروں؟" انہوں نے ناگواری سے منہ بنایا "اگر وہ تھوڑے سے پیسے مل جاتے تو......"

"کیا کہا پیسے؟" "دو مہینے کی تنخواہ تو پہلے ہی ایڈوانس لے چکے ہو" میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔" وہ نخوت سے آگے بڑھ گئیں شازیہ نے اپنی ماں کو بڑی حیرت اور افسوس سے جاتے ہوئے دیکھا اور کریم کو ہمدردانہ نظروں سے دیکھتی ہوئی اندر چلی گئی۔ واپس اپنے کمرے میں آئی تو ان نوٹوں کو دیکھا جو اس کی ممّی نے اس کو عید کے لئے دیئے تھے۔ اچانک کسی خیال کے تحت اس کی آنکھیں چمک اٹھیں وہ کتاب رکھ کر روپے لے کر کمرے سے باہر چل دی۔

"شازیہ تم کپڑے لے آئیں؟" صبح ناشتہ کرتے ہوئے اس کی ممّی کو یاد آیا "جی...... جی ممی لے آئی" شازیہ بوکھلا گئی "اچھا مگر تم نے دکھائے نہیں" "وہ دراصل ممّی میں نے ٹیلر کو سلنے کے لئے دیئے ہیں۔" اس نے اب بوکھلاہٹ پر قابو پالیا تھا۔ "اچھا ٹھیک ہے" وہ مطمئن ہو گئیں۔

چاند دیکھنے کی اطلاع آچکی تھی شازیہ ابھی ابھی

شاپنگ کر کے لوٹی تھی۔ "شازیہ بیٹی سوٹ لے آئیں؟" "وہ...... وہ...... ممی" شازیہ گھبرا سی گئی دراصل ممی ابھی آپ دیکھ لیں تو کیا مزا آئیگا کل دیکھ لیجئے گا۔ مجھے پہنے ہوئے۔ ورنہ ساری شو چلی جائے گی۔" اس نے لاڈ سے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے بیٹے جیسے تمہاری مرضی" ممی نے کہا۔

آج عید کی صبح تھی اس کے ڈیڈی عید کی نماز پڑھ کر آئے اور اپنی بیٹی کو گلے سے لگا کر خوب پیار کیا اور عیدی دی۔ جبکہ اس کی ممی اس کو تیز نظروں سے گھور رہی تھی۔ "شازیہ......" "جی ممی" "تم نے کپڑے کیوں نہیں پہنے" "ممی یہ بھی تو نئے کپڑے ہیں۔ میں نے انہیں ایک دفعہ بھی نہیں پہنا ہے۔" "مگر وہ نئے کپڑے کہاں ہیں جو تم نے عید پر بنائے تھے" "وہ ممی دراصل میں نے خریدے ہی نہیں تھے" شازیہ نے سر جھکا کر کہا "مگر کیوں؟ تم نے وہ پیسے کیا کیئے" "وہ پیسے تو ممی میں نے کریم کو دیئے تھے"

"یہ سب کیا قصہ ہے بیٹی، مجھے بھی تو بتاؤ۔" اس کے ڈیڈی حیران و پریشان کھڑے تھے۔ "میں بتاتی ہوں۔ کریم کے چھوٹے بیٹے کی حالت بہت نازک تھی اور کریم نے چونکہ دو مہینے کی تنخواہ ایڈوانس لے لی تھی اس لئے ممی نے اسے مانگنے پر بھی مزید پیسے نہیں دیئے۔ ڈیڈی اگر اب کے عید پر میں نے نئے کپڑے نہیں بنائے تو کیا فرق پڑ گیا میرے پاس تو سارے نئے سوٹ ہیں۔ لیکن ممی ان پیسوں سے کریم کے بیٹے کی جان بچ گئی۔ "ممی" وہ ماں کے قریب آگئی "آپ بھی تو ماں ہیں۔"

"آپ ماں بن کر سوچئے۔" اس کی ممی تڑپ اٹھیں۔

ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے شازیہ بھی رو رہی تھی پھر اس نے کریم کو آواز دی۔ کریم اور اس کے بیوی بچے سب نئے کپڑے پہنے ہوئے خوشی سے چہرے جگ مگ کرتے آگئے۔ یہ دیکھئے یہ لوگ کتنے خوش ہیں! ممی کیا ان سب کو دیکھ کر آپ کو سچی خوشی حاصل نہیں ہوئی؟

سچی خوشی تو "سچی عید" میں ہے۔

ممی کو اچانک لگا جیسے شازیہ کا قد تیزی کے ساتھ بڑھنے لگا ہے۔ اور وہ لمحہ بھر میں ان سے بھی زیادہ بلند ہو گئی ہے۔ انہوں نے شازیہ کو گلے لگانا چاہا۔ مگر پھر یوں ہچکچا کر پیچھے ہٹ گئیں جیسے اگر انہوں نے شازیہ کو چھوا تو وہ میلی ہو جائے گی۔

آنکھ مچولی

وسیم عباس سیالکوٹ

دیکھو آنکھ مچولی آیا
ساتھ اپنے اک تحفہ لایا
اچھی ہیں تحریریں اس کی
دلکش ہیں تصویریں اس کی
دنیا کی یہ سیر کرائے
نگر نگر ہم کو یہ پھرائے
آؤ مانگیں ہم یہ دعا
آنکھ مچولی رہے سدا

جھوٹا سچ

احمد آفتاب کراچی

بیگم اشفاق اپنے کمرے میں داخل ہوئیں اور انہوں نے اشفاق صاحب سے کہا۔ "سنیئے۔ آج عامر دیر سے گھر آیا تھا۔" اشفاق صاحب نے کتاب سے سر اٹھایا اور منہ بنا کر بولے۔ "اونہوں بیگم۔ عامر دیر سے آیا تھا۔ تو اس میں مجھے بتانے والی کیا بات ہے۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ ہو۔"

"نہیں۔ یہ بات نہیں۔ میری پریشانی کی وجہ کچھ اور ہے۔"

"کیا؟۔"

"آج عامر نے اسکول سے آکر کھانا نہیں کھایا تھا۔" بیگم اشفاق بولیں۔ "میں نے کھانے کے لئے پوچھا تو اس نے منع کر دیا۔ کہنے لگا اس نے اسکول سے آتے ہوئے دو سیب کھالئے تھے اور اس وقت بھی اس کے بستے میں چار سیب موجود ہیں۔"

"یہی میں نے بھی اس سے پوچھا تھا۔" انہوں نے کہا۔ "تو اس نے مجھے ایک عجیب فضول سی بے سروپا کہانی سنا دی۔ کہنے لگا کہ وہ اسکول سے آتے ہوئے راستے میں چھوٹی ندی پر تھوڑی دیر شکار کے لئے بیٹھ گیا تھا۔ وہاں اس کی ایک چھوٹی سی مچھلی پکڑنے کا بنسی ہر وقت موجود ہوتی ہے۔"

"جی۔ مجھے معلوم ہے۔"

"تو یوں ہی بیٹھے بیٹھے، اچانک ایک اور شخص بھی وہاں آگیا۔ جس نے فوج کی وردی پہنی ہوئی تھی اس شخص کے کندھے پر بڑی سی بندوق لٹک رہی تھی۔ وہ تھوڑا سا گھبرایا ہوا لگ رہا تھا اور اس نے منہ پر کپڑا لپیٹ کر اپنی شکل چھپائی ہوئی تھی۔"

"پھر؟۔"

"وہ شخص عامر کے قریب آگیا اور کہنے لگا۔ کہ اگر عامر آئندہ چھوٹی ندی میں مچھلی پکڑنے کا وعدہ کرلے تو وہ اسے چھ سیب دے گا۔ عامر نے جو اس کی وردی اور بندوق سے خوفزدہ ہو گیا تھا، وعدہ کر لیا اور سیب لیکر وہاں سے چل پڑا۔ تھوڑی د[illegible] اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ شخص ایک تھیلے میں سے بڑے بڑے پتھر نکال کر پانی میں پھینک رہا تھا۔ ایسے ہی جیسے بچے پانی میں پتھر اچھال کر دائرے بناتے ہیں۔ پھر وہ وہیں جھاڑیوں کے پیچھے غائب ہو گیا تھا۔"

"ہوں۔ تو آپ کو اس تمام قصّے سے کیا پریشانی ہے؟۔" اشفاق صاحب نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے۔ کہ عامر نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔" وہ آہستہ سے بولیں۔ "اس نے یقیناً وہ سیب سیٹھ کریم کے باغ سے چوری کئے ہیں۔ اور اپنے جھوٹ کو چھپانے کے لئے یہ کہانی گھڑ لی ہے۔ میں نے ان کے باغ کے مالی سے بھی پوچھ لیا ہے۔ واقعی ان

کے باغ کے ایک درخت میں سے سیب ٹوٹے ہوئے ہیں۔"

اشفاق صاحب کچھ نہ بولے ۔ یہ تو واقعی بڑی پریشانی کی بات تھی عامر کی طرف سے آج تک ان کو کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ مگر آج عامر نے دو بڑے کام کئے تھے۔ اوّل تو چوری کی تھی اور دوسرے اپنے جرم کو چھپانے کے لئے جھوٹی کہانی گھڑلی تھی۔ انہوں نے اسے سزا دینے کا سوچا، مگر پہلی مرتبہ کا خیال کر کے معاف کر دیا۔ ہاں دوسری مرتبہ اسے معاف نہیں کریں گے۔ انہوں نے سوچا۔

"آج عامر پھر دیر سے گھر آیا تھا۔" اگلے دن بیگم اشفاق نے پھر اشفاق صاحب سے کہا۔

"کیا آج بھی اس نے دیر سے گھر آنے کا کوئی بہانہ کیا تھا؟"

"جی ہاں۔ آج آتے ہی مجھ سے کہنے لگا کہ اسے پھر وہ آدمی ملا تھا۔" وہ بولیں "عامر اس وقت وہاں سے مچھلی پکڑ کر واپس آرہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی عامر نے مچھلی چھپانے کی کوشش کی مگر وہ دیکھ چکا تھا۔ اس نے آتے ہی عامر کو گزشتہ روز کا کیا ہوا وعدہ یاد دلایا۔ پھر زور سے ڈانٹ کر مچھلی دریا میں پھینکنے کا حکم دیا۔ عامر نے ڈر کر مچھلی واپس پھینک دی۔"

"پھر کیا ہوا۔ ؟"

"مچھلی واپس پھینکنے کے انعام کے طور پر اس نے عامر کو سو روپے دیئے۔" انہوں نے کہا۔ "وہ کہنے لگا کہ اس کو خدا نے مچھلی کی جان بچانے کے لئے بھیجا ہے۔ اور وہ مچھلی کی جان بچا کر واپس چلا جائے گا۔ لیکن اگر عامر نے اس کا ذکر کسی شخص سے کیا تو وہ اپنے جادو کے زور سے اسے سزا دے گا۔ جادو دکھانے کے لئے، اس نے اپنے جیب سے بڑے بڑے چمکتے ہوئے پتھر نکالے اور "چھو" کر کے انہیں دریا میں پھینک دیا۔"

"ہونہہ ۔ جادو۔" اشفاق صاحب نے غصے سے بولے۔ "مجھے یقین ہے عامر نے وہ سو روپے کہیں سے چرائے ہیں اور اپنے جھوٹ کا اثر کم کرنے کے لئے یہ کہانی سنائی ہے۔ بلاؤ اسے۔ کہاں ہے وہ؟۔"

"اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اس سے کمرے میں ہی بات کر لیتا ہوں۔" وہ اٹھ کر عامر کے کمرے میں چلے گئے۔ پھر دو زور دار طمانچوں کے ساتھ عامر کے رونے کی آواز آئی۔ اشفاق صاحب تھوڑا بہت چیخے چلائے اور اپنے کمرے میں واپس آگئے۔ مگر اب ان دل اداس ہو گیا تھا۔ آج تک انہوں نے عامر کو ہلکے سے ڈانٹا تک نہیں تھا پریشان ہو کر انہوں نے کہا۔ "بیگم میں ذرا باہر جا رہا ہوں ٹہلنے۔ ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ گھر سے باہر آگئے۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گلی کے موڑ پر ان کی ملاقات احمد صاحب سے ہو گئی۔ احمد صاحب انہیں دیکھ کر چیخے۔

"ارے بھئی اشفاق صاحب۔ کچھ سنا آپ نے۔ ؟ سیٹھ کریم کے گھر میں زبردست قسم کی چوری ہو گئی ہے۔"

"چوری ہو گئی ہے۔ ؟ کس چیز کی۔ ؟" اشفاق صاحب نے کہا۔

"ان کے خاندانی جواہرات کی۔ کسی نے چور کو چوری کرتے نہیں دیکھا اور سب کچھ غائب ہو گیا۔ پولیس بھی چکرائی ہوئی ہے۔" احمد صاحب بولے۔ "ویسے سیٹھ کریم کہہ رہے تھے کہ چور جلد ہی پکڑا جائے گا۔ کیونکہ وہ جواہرات خاصے بڑے بڑے ہیں۔" انہوں نے قریب پڑے پتھر کو دیکھ کر اشارہ

کیا۔ "کوئی اس کے جتنے ہوں گے۔ کوئی انہیں نہیں بیچ سکتا۔"

"پتھر کو دیکھ کر اشفاق صاحب یکدم چونکے۔ بجلی کی طرح ایک خیال ان کے ذہن میں آیا تھا۔ وہ اچانک پلٹے اور تیزی سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ "بیگم۔" اندر داخل ہو کر وہ چلائے۔ "عامر کہاں ہے۔؟"

"عامر۔ وہ تو روتے روتے سوگیا ہے۔ کیوں۔؟"

"اٹھاؤ اسے۔ ہمیں فوراً جانا ہے۔" پھر وہ خود ہی عامر کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

○

تھوڑی ہی دیر بعد اشفاق صاحب عامر کے ہمراہ اپنے علاقے کے تھانے کے انچارج کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے برابر میں سیٹھ کریم تھے۔

"واہ بھئی اشفاق صاحب۔" تھانہ انچارج کامران خان نے کہا۔ "مان گئے آپ کی ذہانت کو مگر اب تو بتا دیجئے۔ آپ نے کیسے اندازہ لگایا کہ جواہرات کی چوری کا مجرم! سیٹھ صاحب کا ذاتی محافظ ہے۔؟"

"اوہوہ۔" اشفاق صاحب ہنسے۔ "اجی مجرم کو میں نے نہیں۔ میرے بیٹے عامر نے پہچانا ہے۔" انہوں نے عامر کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کا موڈ ابھی تک خراب تھا۔ پھر اشفاق صاحب نے عامر کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو بیان کر دیا۔ "شروع میں میں سمجھا تھا کہ عامر ہم سے غلط بیانی کر رہا ہے۔ لیکن آج جب احمد صاحب نے مجھے جواہرات کا سائز بتانے کے لئے پتھر دکھایا۔ تو یکدم مجھے عامر کی بات کا خیال آگیا۔ اس شخص نے پہلی اور دوسری دونوں ملاقاتوں میں ندی میں پتھر پھینکے تھے۔ مجھے یہ بات عجیب سی لگی کہ ایک آدمی بچوں کے طرح پانی میں پتھر پھینکتا پھرے۔ میرا دھیان فوراً ان جواہرات کی طرف گیا۔ میں نے اس وقت عامر کو ساتھ لیا اور ندی جاکر اس جگہ کا جائزہ لیا جہاں اس شخص نے پتھر اچھالے تھے۔ پھر سارے جواہرات تھوڑے تھوڑے فاصلے سے وہاں مل گئے۔ میں جواہرات لیکر سیٹھ کریم کے گھر آگیا۔ جہاں عامر نے بآسانی مجرم کو پہچان لیا۔ واقعی اس کی وردی اور بندوق دیکھ کر کوئی بھی بچہ اسے فوج کا سپاہی کہہ سکتا تھا میں پھر ہم نے اسے قابو کر لیا اور آپ کو فون کر دیا۔"

"پر وہ جواہرات ندی میں پھینکنے کے بجائے لیکر بھاگ کیوں نہیں گیا۔؟" سیٹھ کریم نے پوچھا۔

"اس نے جواہرات اس لئے ندی میں پھینک دیئے تھے کہ جب معاملہ ٹھنڈا ہوجائے گا تو وہ انہیں وہاں سے نکال لے گا۔ اور پھر سیٹھ صاحب کا نوکری چھوڑ کر کہیں دور چلا جائے گا۔ نوکری چھوڑے بغیر جانے کی صورت میں پولیس ضرور اس پر چوری کا مقدمہ بناتی۔ جو اسے منظور نہ تھا۔" اشفاق صاحب نے سارا معاملہ صاف کر دیا۔

"بہرحال اشفاق صاحب۔" کامران خان نے کہا۔ "آپ کی مدد کا بہت بہت شکریہ۔" اشفاق صاحب اس سے ہاتھ ملانے کے بعد اپنے گھر آگئے راستے میں انہوں نے عامر سے اپنے رویئے کی معذرت کرلی تھی۔ اور دل میں عہد کرلیا تھا آئندہ وہ بغیر تفتیش کے کسی بات پر یقین نہیں کریں گے۔

اقوال زریں

مرسلہ۔ کاشف انصار، کراچی

ا ...... علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

(حدیث شریف)

۲...... علم مال سے بہتر ہے کیونکہ مال خرچ کرنے سے گھٹتا ہے اور علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔
(حضرت علیؓ)

۳...... خاموشی غصّے کا بہترین علاج ہے۔
(حضرت عثمان غنیؓ)

۴...... پرانے گناہوں کو نئی نیکیوں سے مٹادو۔
(حضرت ابو بکر صدیقؓ)

۵...... دنیاکی عزت مال سے اور آخرت کی عزت اعمال سے ہے۔ (حضرت عمر فاروقؓ)

۶...... راست بازی اور حق گوئی اسلام کی روح ہے۔
(حضرت عثمان غنیؓ)

۷...... شکست سے موت بہتر ہے۔ (طارق بن زیاد)

۸...... ایمان کے چار ستون ہیں (۱) صبر (۲) یقین (۳) عدل (۴) جہاد (حضرت علیؓ)

"شرارت کا انجام"

مرسلہ نورین عتیق۔ کراچی

امتحانات کے ختم ہونے کے بعد ہم سب دوست فارغ تھے، لہٰذا سب نے مل کر پروگرام بنایا کہ ساحل سمندر پر گھومنے جایا جائے۔ مقررہ دن سب دوست تیار ہو کر ایک جگہ جمع ہوئے اور وہاں پھر ایک عام بس کے زریعہ ساحل سمندر پر جاپہنچے۔ سب دوست بے انتہا خوش تھے ایک دوسرے پر پانی پھینکا جارہا تھا مگر والدین کی ہدایت کی وجہ سے پانی میں آگے کوئی نہ گیا سب ساحل کے قریب ہی پانی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

کھیل کود سے تھک گئے تو ساحل پر ہی چادر بچھا کر گھر سے لائی ہوئی چیزوں سے انصاف کرنے لگے پر تھوڑی دیر ستانے کے بعد فن لینڈ کی طرف روانہ ہوئے وہاں بھی کافی وقت گزارا اور خوب مزے کیئے۔ امّی نے مغرب سے قبل گھر لوٹ آنے کی تاکید کی تھی اس لئے ہم مغرب سے بہت پہلے بس اسٹاپ پر جاپہنچے خوش قسمتی سے ہمیں اپنی مطلوبہ بس جلد ہی مل گئی مجھے کھڑکی کے پاس بیٹھنے کا شوق ہے لہٰذا میں جلدی سے چڑھ کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ ہی میرا دوست عدنان بیٹھا۔ بس چل پڑی اور ہم آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ایک جگہ بس اسٹاپ پر بس رکی میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا اتنے میں ایک لڑکا میری کھڑکی کے پاس آیا اور مجھ سے پوچھا کہ "کیا یہ بس فلاں علاقے تک جائے گی؟" میں اس علاقے کے متعلق نہیں جانتا تھا لیکن مجھے اور میرے دوست کو شرارت سوجھی ہم نے اُس سے کہا کہ "یہ نہیں وہ سامنے والی بس جائے گی۔" وہ لڑکا دوڑ کر اس بس میں سوار ہو گیا اور

بس چل پڑی۔ ہم سارے راستے مزہ لیتے رہے کہ جب وہ لڑکا مطلوبہ جگہ کے علاوہ کہیں اور پہنچ جائے گا تو کتنا جھنجھلائے گا۔ گھر پہنچ کر تھکن کی وجہ سے میں جلد سو گیا۔ اگلا دن بھی کچھ سو کر اور کچھ ناول پڑھ کر گزارا۔ تیسری صبح اخبار میں ایک اشتہار دیکھ کر میں چونک گیا۔ اخبار میں تلاش گمشدہ کا ایک اشتہار اسی لڑکے کے متعلق تھا جسے ہم نے غلط بس میں سوار کروا دیا تھا لڑکے کا نام اشتہار میں عاصم تھا نیچے تفصیلات میں اسی دن کی تاریخ درج تھی۔گویا وہ دو دونوں سے گھر نہیں پہنچا تھا۔

اب تو مجھے اغوا اور اسی قسم کے دوسرے واقعات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے اور میں خود کو اس لڑکے کا مجرم محسوس کرنے لگا میری کیفیت کو دادا جان نے بھانپ لیا۔ انہوں نے انتہائی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے تم کچھ پریشان لگ رہے ہو" میں جو گم صم بیٹھا تھا چونک پڑا۔

"...... وہ دادا جان ......" اب میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں تھے۔

"ہاں ہاں بتاؤ کیا بات ہے۔" دادا جان نے میری حوصلہ افزائی کی۔

پھر میں نے پورا واقعہ دادا جان کے گوش گزار کر دیا۔ "اوہ یہ تم نے بہت بُرا کیا" دادا جان نے افسوس اور تفکر سے بھرپور لہجہ میں کہا۔

"دادو آپ پلیز کچھ کیجئے۔ اشتہار میں لکھا کہ کہ اس کی والدہ کی طبیعت سخت خراب ہے۔"

"اچھا ٹھہرو میرے دوست کا بیٹا پولیس میں ہے شاید وہ کچھ مدد کر سکے" یہ کہہ کر دادا نے ان کے نمبر ڈائل کیئے اس سے لڑکے کو تلاش کرنے میں مدد کے لئے کہا۔ اس نے بھرپور مدد کا یقین دلایا۔ "یااللہ اس لڑکے کو اپنے والدین سے ملا دے" میں نے خلوصِ دل سے دعا کی میں دادا جان کے ساتھ اخبار میں دیئے ہوئے پتہ پر اسکے والدین سے ملنے بھی گیا اس کی والدہ بہت علیل تھیں۔ والد بھی بہت پریشان تھے۔ وہ مجھے اپنے بیٹے کا دوست سمجھ کر شفقت سے ملے۔ پر میرے دل پر بوجھ بہت بڑھ چکا تھا۔ میں ہر پل اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر اس لڑکے کے لئے دعا مانگتا رہا۔ شاید اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول کر لی۔ دادا جی کے دوست کے بیٹے نے فون کے ذریعہ اس لڑکے کا مل جانے کی اطلاع دی۔ میں دادا کے ساتھ اس سے ملنے گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بس دوسرے شہر جا رہی تھی۔ جب اپنی مطلوبہ جگہ نہ پا کر عاصم رونے لگا تو اسے بس میں موجود ایک شخص نے تسلی دی کہ وہ اسے اگلے دن گھر پہنچا دے گا۔ مگر اس شخص کا تعلق خرکاروں کے گروہ سے تھا وہ عاصم کو اپنے گھر لے گیا۔ اس آدمی نے اپنے گروہ کو عاصم کے متعلق اطلاع دے دی تھی۔ انکا ارادہ عاصم کو دوسرے شہر لے جا کر کسی دوسرے گروہ کے ہاتھ فروخت کرنے کا تھا۔ لیکن جب ان کا ایک گروہ عاصم کو لے کر ریلوے اسٹیشن پہنچا تو پولیس نے جو پہلے ہی ریلوے اسٹیشن پر نظر رکھے تھی اس شخص کو گرفتار کر لیا۔ میں نے عاصم سے معافی مانگی۔ عاصم اچھا لڑکا تھا اس نے مجھے معاف کر دیا۔ میں آج بھی جب کبھی اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کبھی کبھی معمولی شرارت کس قدر خطرناک بن جاتی ہے۔

سالگرہ کے ساتھی

اپریل کے مہینے میں پیدا ہونے والے ساتھیوں کا تعارف

ممتاز علی راہوں۔ گیارھویں
یکم اپریل ۱۹۷۴ء
کرکٹ کھیلنا، کتابیں پڑھنا۔ حساب
انجینئر۔ شوق ہے۔ ۲/۴ لا جیکب لائن
ہاؤسنگ کمپلیکس کراچی

بدر عزیز خان۔ دہم
یکم اپریل ۱۹۷۵ء
کرکٹ کھیلنا۔ مطالعہ پاکستان۔ معزز
شہری۔ اے/۲۳۲ بلاک (این) نارتھ
ناظم آباد کراچی۔

زاہد محمود۔ ہشتم (بی)
یکم اپریل ۷۴ء، کرکٹ
کھیلنا۔ حساب، انگلش۔ ڈاکٹر۔
۵/۸۵۲ لیاقت آباد کراچی ۱۹
سندھی ہوٹل

غلام جعفر کھوکھر۔ فرسٹ ایئر
یکم اپریل ۱۹۷۴ء
کرکٹ کھیلنا۔ بیالوجی۔ ڈاکٹر
کھوکھر آٹو سٹور جی۔ ٹی روڈ کستووال
ضلع ساہیوال

محمد اسد مرزا۔ دہم
۲ اپریل ۱۹۷۳ء
قلمی دوستی، مطالعہ کرنا۔ حساب بزنس
مین۔ اس لیے کہ بزنس کو ترقی دیں۔ گورنمنٹ
مسلم ہائر سیکنڈری سکول ٹیپو روڈ راولپنڈی

علی عمران۔ سیکنڈ ایئر
۵ اپریل ۷۲ء۔ اداکاری
کرنا۔ اردو، انگلش۔ اچھا اداکار
A-14 سوسائٹی اپارٹمنٹ، کشمیر روڈ
پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس۔ کراچی ۷۵۴۰۰

عامر اقبال۔ ہشتم
۵ اپریل ۷۷ء۔ کہانیاں لکھنا
رسالے پڑھنا۔ حساب۔ پائلٹ۔ اپنے وطن کو
دشمنوں سے بچانے کیلئے۔ ۴ بی اے سی ماشاءاللہ
انٹرپرائیزز۔ الفلاح سوسائٹی، کراچی ۲۵

محمد شاہد مغل۔ پنجم
۱۲ اپریل ۷۷ء
آنکھ مچولی پڑھنا۔ ڈرائنگ۔ آرٹسٹ
مکان نمبر ۲۰/۲۹ الف سیکٹر
منظور کالونی کراچی ۴۳

مرزا مسعود بیگ۔ دہم
۱۴ اپریل ۷۴ء
ٹکٹیں جمع کرنا اور مطالعہ۔ سائنس۔ ڈاکٹر۔
دُکھی انسانیت کی خدمت۔ اقبال منزل نزد
مسلم کمرشل بنک۔ ستیانہ روڈ فیصل آباد

جواد احمد۔ دہم
۱۵ اپریل ۷۳ء۔ قلمی
دوستی۔ ٹکٹ جمع کرنا۔ اردو۔ ایڈووکیٹ
برکات منزل املی اسٹریٹ بھیرہ
ضلع سرگودھا

پرنس عبداللطیف زخمی۔ دہم
۲۰ اپریل ۷۴ء۔ قلمی
دوستی، مطالعہ کرنا۔ پنجابی انگلش۔ قوم کی خدمت
بمقام و ڈاکخانہ آدم پور تحصیل ننکانہ صاحب
ضلع شیخوپورہ

سلمان عادل۔ نہم (الف)
۲۱ اپریل ۱۹۷۶ء۔ سکے
جمع کرنا اور ٹیبل ٹینس کھیلنا۔ بیالوجی۔ انجینئر
واپڈا کالونی۔ فلیٹ نمبر ۱۶ سی۔ حسین آباد
حیدر آباد۔ سندھ

محمد حبیب القادر۔ انٹر
۲۰ اپریل ۷۲ء۔ بہن
بھائیوں سے قلمی دوستی۔ بیالوجی۔ سچا ہمدرد
لوگ دُکھی ہیں۔ چاہ مورت والا
ملتان ۶۰۵۰۰ پاکستان

موران خٹک۔ دہم (اے)
اپریل ۷۲ء۔ دینی کُتب
کا مطالعہ۔ اسلامیات۔ فوجی۔
تحصیل و ضلع کوہاٹ ڈاکخانہ محسن خیل
(لاچی)

عبدالقیوم فتح محمد قریشی
ہشتم۔ آنکھ مچولی اور دیگر
کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ اسلامیات۔ مُعلّم
علم کی روشنی پھیلانا۔ پھلیلی بار۔ محمدی چوک
قاسمی ہوٹل۔ حیدر آباد۔ سندھ

نام ـــــــ عمر ـــــــ جماعت ـــــــ
مشاغل ـــــــ پسندیدہ مضمون ـــــــ
بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں ـــــــ وجہ ـــــــ
پتہ ـــــــ

امّی ابّو کا صفحہ

ہما سلیم

بچوں کے تعلیمی معاملات کے سلسلے میں والدین کو اکثر بہت سے مسائل کا سامنا رہتا ہے۔ خصوصاً اچھی "درس گاہ کا انتخاب" وہ معمہ ہے جسے بہت کم والدین آسانی سے حل کر پاتے ہیں۔ چونکہ شہروں میں تعلیمی اداروں کی تعداد دیہاتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے اس لئے "درس گاہ کے انتخاب" کا مسئلہ بھی بنیادی طور پر شہر کے مکینوں کا ہے۔

شہروں، خصوصاً بڑے شہروں میں اسکولوں کا قیام ایک منفعت بخش کاروبار یا ایک نئی صنعت کے طور پر سامنے آیا ہے۔ نتیجتاً ہر صاحب ثروت شخص اسکول کھولنے کی فکر میں ہے۔ ایک کرائے کے گھر یا کسی بنگلہ کوٹھی سے اسکول کا آغاز ہوتا ہے، اور پر کشش انگریزی ناموں کے یہ اسکول سماجی مرتبے کی علامت سمجھے جاتے ہیں اور اس جھوٹے مرتبے کے سراب میں پھنس کر نہ جانے کتنے والدین اپنی بنیادی ضرورتوں اور خواہشوں کا گلا گھونٹ کر بھی بھاری فیسیں ادا کرتے رہتے ہیں اور اپنے آپ کو اس تصوّر سے بہلاتے رہتے ہیں کہ اس انگلش میڈیم اسکول سے پڑھنے والا ان کا بچّہ مستقبل میں کوئی بلند پایہ شخصیت بن کر ان کی امیدوں میں یقین کے رنگ بھر دے گا۔ اسکولوں کے معیار کو جانچنے کا یہ انوکھا پیمانہ جانے ہم نے کیوں وضع کر رکھا ہے کہ جس اسکول کی جتنی زیادہ فیس ہوگی وہ اسکول بھی اتنا ہی اچھا ہوگا۔

کیا واقعی ایسا ہے ...... ؟

ہم نے اس سوال کے صحیح جواب تک پہنچنے کے لئے اپنے طور پر ایک طریقہ کار وضع کیا اور ایک سروے کر

ڈالا...... جن سوالوں کے جواب ہم نے حاصل کئے وہ یہ تھے۔

(۱) ...... دنیا کی بڑی اور نامور شخصیات کیا بظاہر بہت اچھے اسکولوں سے پڑھ کر نکلیں۔ ...... ؟

(۲) ...... ہمارے ہاں پوزیشن ہولڈر بچّوں کا تعلق جن اسکولوں سے ہوتا ہے کیا وہ بڑے شان و شوکت والے اسکول ہیں...... ؟

(۳) ...... جن اسکولوں کے بچّے پوزیشن لیتے ہیں کیا وہاں بچّے فیل بھی ہوتے ہیں اگر ایسا ہے تو کیوں ......؟

ہم نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے ان سوالوں کے جواب حاصل کرنے کی کوشش کی اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے۔

(۱) ...... اسکولوں کا معیار فیس یا دکھاوے سے نہیں بلکہ اس کے اندرونی نظم و ضبط اور اساتذہ کی قابلیت اور پیشہ ورانہ لگن سے ہے۔

(۲) ...... جو بچّے اچھے نتائج، نمایاں کامیابی یا پوزیشن حاصل کرتے ہیں ان میں سے بڑی تعداد ایسے بچوں کی ہے جن کے والدین ان کے تعلیمی معاملات میں بے حد دلچسپی لیتے ہیں اور اپنے وقت میں سے کچھ وقت انہیں باقاعدگی سے دیتے ہیں۔

(۳) ...... تمام فیل ہونے والے یا پھسڈی بچوں کے والدین یا تو ان کی تعلیم سے عملاً لاتعلق ہیں یا اس راہنمائی سے محروم ہیں کہ وہ دلچسپی تو لیں مگر کس طرح۔

جو بات ثابت ہوئی وہ یہ ہے کہ والدین کا بچّوں کے تعلیمی معاملات میں دلچسپی لینا ان کی اچھی کار کردگی کے لئے زیادہ اہم ہے جبکہ اچھے اسکولوں کی اہمیت کا نمبر اس کے بعد آتا ہے۔ بس آپ کا بچہ جس اسکول میں بھی پڑھتا ہے، آپ چاہیں تو اس پر قناعت کر سکتے ہیں۔ اور اگر کچھ وقت اپنے بچوں کو باقاعدگی سے عنایت کرتے رہیں تو آپ بھی وہ نتائج حاصل کر سکتے ہیں جو دولت مند والدین محض اپنی لاپرواہی کے ساتھ بہت بڑے اسکولوں سے بھی حاصل نہیں کر پاتے۔

Every Morning
Every Night
Keep Them Healthy
Keep Them White
ACTION
JUNIOR TOOTHBRUSH
Begin your day with
ACTION...
.... and what a day it would be.
A day full of smiles, laughter
and ofcourse –healthy
gums and clean teeth.
Now
also available
at all Utility
Stores.
UNIVERSAL BRUSHWARES (PVT) LTD.

REGD. NO. M-266 APRIL 1990
MONTHLY AANKH MICHOLLE KARACHI